سفرِ حیات

مولانا وحید الدّین خاں

سفرِ حیات

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

آغازکلام	7	جنت کا تعارف	34
امید کی کرن	8	موت کا مسئلہ	35
سوچئے، سوچئے، سوچئے	9	موت کا المیہ	36
انسان کی کہانی	11	موت کا پیغام	37
زندگی کی حقیقت	16	موت کا واقعہ	38
نگاہ عبرت	17	موت کا تصور	39
انسانی شخصیت	18	ہادم لذات	40
عمر اور صحت	19	کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا	41
بڑھاپے کی عمر	20	اپنی نمازِ جنازہ	45
بڑھاپے سے سبق لینا	21	موت کا تجربہ	46
بڑھاپا آنے سے پہلے	22	زندگی اور موت	47
ہر شخص موت کا مسافر	23	بڑائی کی نفی	48
موت	24	زندگی اور موت	49
موت کا شعور	25	پروموشن کی خبر	50
موت کے دروازے پر	26	خودکُشی: سب سے بڑی دیوانگی	51
وقت ختم ہو گیا	27	خوش نما فریب	52
موت کی خبر	28	موت: ایک خدائی منصوبہ	53
تیاری کا دور	29	موت کا ظاہرہ	54
موت کی حقیقت	30	موت کا مثبت تصور	55
موت کے قریب	31	موت کی طرف سفر	58
موت کا تجربہ	32	موت کا ذکر کثیر	59
موت کا سبق	33	ایک رِمائنڈر	60

ایک خط 61
اچانک موت 63
یاددہانی کی موت 64
آخرت کا ائرپورٹ 65
موت کا الارم 66
ابدی صحرا 67
انفرادی زلزلہ 68
موت کا زندہ تصور 69
موت کا سبق 70
موت کی یاد 71
بامعنی زندگی 72
موت سے پہلے، موت کے بعد 73
امید پر خاتمہ 74
آخری پیشی 76
سانس کا کاروبار 77
زندگی کا خاتمہ 78
خاتمۂ حیات 79
منصوبۂ حیات 80
موت: ایک عالم گیر قانون 81
زندگی المیہ کیوں 82
قیامت دستک دے رہی ہے 83
قیامت کا تجربہ 85
یہ بے خبر انسان 87
موت کی یاد: ایک صحت مند عمل 88
ذہنی سکون کا راز 90
موت کی یاد کا مثبت پہلو 93
کوئی چیز ملکیت نہیں 94
موت سے بے خبری کیوں 95
لائف بیانڈ لائف 112
دستک 114
دیوارِ قہقہہ 115
بریک اِن ہسٹری 119
انسان کی منزل 121
کل کا سورج 122
ایک دورِ حیات کا خاتمہ 123
جنت اور انسان 125
دنیا، آخرت 129
جنت کی نرسری 130
دو دنیائیں 139
انسان کی دریافت 140
آخرت سے غفلت کیوں 142
واپسی ممکن نہ ہوگی 143
زندگی کے اُس پار 144
موت کے بعد 145
موت کی غیر یقینی دیوار 146
حقیقی دنیا، تصوراتی دنیا 148
آخرت میں بے جگہ 149
دوڑ بے منزل 150
آنے والا کل 151
موت ایک یاددہانی 152

دار العمل دار الجزاء 153
انسان کی تخلیق 154
رفیقِ اعلیٰ کی طرف 155
خوشی صرف آخرت میں 156
مسرت کی تلاش 157
عقیدہ آخرت کی طاقت 158
کامیاب انسانوں کی ناکامی 159
لذتوں کو ڈھانے والی 160
تکاثر سے قبر تک 161
آخر میں قبر 162
لازمی تجربہ 163
موت کی خبر 164
احتساب یا استقبال 165
موت کے بعد 166
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا 167
پہلی زندگی، دوسری زندگی 171
فرسٹ، سکنڈ 172
جس خوشی کی ہمیں تلاش ہے 173
تکمیلِ آرزو 175
تقدیرِ انسانی 176
جنت اور جہنم 178
نشانِ منزل 179
فہرستِ آرزو 180
خدا کا پڑوس 181
جنت کا سودا 182
امتحان گاہ 183
امتحان کے لیے 184
پہلے آپ 185
اچانک پیشی 186
تنکیس کا عمل 187
اعلیٰ ذوق 188
حُبّ عاجلہ 189
فطرت کا عطیہ 190
سب سے بڑی بے خبری 191
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا 192
سب کچھ سے بے کچھ کی طرف 193
بے خوفی کی نفسیات 194
زلزلہ ایک وارننگ 195
دردناک انجام 196
موت کا شعوری ادراک نہیں 197
سب سے بڑی بھول 198
ایک نشانی 199
صرف ایک بار 200
کامیاب زندگی، ناکام خاتمہ 201
آخری گیت 203
آنا اور جانا 204
مرنے والوں کا تذکرہ 205
لمبی عمر 206

آغاز کلام

زیرنظر کتاب حیاتِ انسانی کے موضوع پر ہے۔یعنی اس موضوع پر کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔اور موت کے بعد جب وہ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ موضوع قرآن کا ایک اہم باب ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کے خالق نے قرآن اس لیے اتارا، تاکہ انسان زندگی کے مقصد کو جانے، اور اس کے مطابق اپنی زندگی کا درست منصوبہ بنائے۔

ہرعورت اور مرد کا یہ معاملہ ہے کہ وہ ایک دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوکر دنیا میں داخل ہوتا ہے، اور پھر سو سال سے کم مدت تک زندگی گزار کر اگلے مرحلۂ حیات کی طرف چلا جاتا ہے۔ قرآن میں اس سوال کا نہایت واضح جواب ملتا ہے۔ ہرعورت اور مرد کا یہ پہلا کام ہے کہ وہ اس سوال کا مستند جواب معلوم کرے تاکہ وہ اس کے مطابق زندگی گزار کر اپنے ابدی دورِ حیات میں کامیابی کا درجہ حاصل کرے۔

زیرنظر کتاب دعوتی لٹریچر میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ تزکیہ کے موضوع پر بھی ایک اہم کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک اعتبار سے یہ کتاب ایک دعوتی کتاب بھی ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ محاسبہ خویش (self-introspection) کا ذریعہ بھی۔

وحیدالدین، نئی دہلی

20 اگست 2016

امید کی کرن

انڈیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان تعلیم کے بعد لندن چلے گئے۔ اب وہ مستقل طور پر لندن میں مقیم ہیں، انھوں نے برٹش شہریت لے لی ہے۔ اپنے سوچ کے اعتبار سے وہ الٹرا سیکولر (ultra-secular) ہیں۔ وہ اسلام یا کسی مذہب کو نہیں مانتے اور بالکل آزادانہ قسم کی زندگی گزارتے ہیں۔

اب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے ہیں۔ ان کی صحت بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھ کر وہ سوچتے ہیں کہ میں بھی اِسی طرح مرنے والا ہوں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ موت کے بعد انسان کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ وہ لندن میں اُن سے ملے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ اگر معلوم ہوتا کہ کوئی ایسا شخص ہے جو یہ جانتا ہے کہ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے تو میں اُس سے انتہائی عاجزانہ درخواست کرتا کہ وہ مجھے اس کے بارے میں بتائے:

I would beg him to tell me what is after death.

اِسی قسم کا ایک واقعہ کرسچن مشنری بلی گرہم نے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک بار میں ایک سفر میں تھا۔ مجھ کو امریکا کے ایک بہت بڑے دولت مند آدمی کا میسج ملا، جس میں کہا گیا تھا کہ فوراً یہاں آ کر مجھ سے ملو۔ جب میں وہاں گیا تو مذکورہ امریکی دولت مند نے کسی تمہید کے بغیر کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی کی تمام معنویت ختم ہو چکی ہے۔ میں بہت جلد ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانے والا ہوں۔ کیا تم مجھ کو امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope?

ایسے کسی سائل سے صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ موت کے بعد کیا ہوگا، اس کو جاننے کا مستند ذریعہ صرف خدا کی کتاب قرآن ہے۔ کوئی انسان نہیں جانتا کہ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے، لیکن خالق ضرور اِس حقیقت کو جانتا ہے اور اس نے اپنی کتاب میں اِس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔

سوچئے، سوچئے، سوچئے

اگر پہاڑ کی کھوہ (cave) سے کسی دن ایک زندہ انسان نکل آئے، تو سارے دیکھنے اور جاننے والے لوگ اس کو حیرت ناک واقعہ سمجھیں گے۔ تمام لوگ یہ سوچنے لگیں گے کہ ایسا کیوں کر ہوا۔ ماں کے پیٹ سے ایک انسان کا پیدا ہونا بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جو دہشت ناک حد تک عجیب ہے۔ لوگ ماں کے پیٹ سے زندہ انسان کو پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔

یہ فرق کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے انسان کا پیدا ہونا روزانہ کا ایک واقعہ ہے۔ بار بار دیکھنے کی وجہ سے لوگ اس واقعے کے عادی (used to) ہو گئے ہیں، اِس لیے وہ اس کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیے رہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لوگ اگر اِس معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچیں تو وہ انسان کی پیدائش کے واقعے میں خالق کے وجود کو دریافت کرلیں۔ جب وہ دیکھیں کہ ایک زندہ اور باشعور انسان پیدا ہو کر زمین پر چل پھر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور بولتا ہے، تو ان کو محسوس ہو کہ ہر انسان خالق کے وجود کا ایک چلتا پھرتا نشان (sign) ہے۔ ہر انسان لوگوں کو اپنے خالق کا ایک زندہ تعارف معلوم ہونے لگے۔

اِسی طرح انسان جب پیدا ہو کر موجودہ زمین (planet earth) پر آتا ہے، تو وہ پاتا ہے کہ یہاں اس کے لیے ایک پورا لائف سپورٹ سسٹم موجود ہے۔ یہ لائف سپورٹ سسٹم اتنا مکمل ہے کہ کوئی قیمت دیے بغیر وہ انسان کی ہر چھوٹی اور بڑی ضرورت کو نہایت اعلیٰ صورت میں پورا کر رہا ہے۔ زمین سے لے کر سورج تک پوری دنیا استثنائی طور پر انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔

اس کے بعد وہ دن آتا ہے جب کہ انسان اچانک مرجاتا ہے۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے ابدی زندگی چاہتا ہے، لیکن سو سال کے اندر ہی یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنی مرضی کے خلاف اِس دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

زمین پر پیدا ہونے والا ہر انسان دو چیزوں کا تجربہ کرتا ہے۔ پہلے زندگی کا تجربہ، اور اس کے

بعد موت کا تجربہ۔ اگر انسان سنجیدگی کے ساتھ ان واقعات پر سوچے تو وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی حقیقت کو دریافت کرے گا، وہ یہ کہ انسان کو پیدا کرکے اِس زمین پر آباد کرنا بطور انعام نہیں ہے، بلکہ وہ بطور امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے۔ یہ آزادی اِس لیے ہے تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ کون شخص بااصول زندگی گزارتا ہے اور کون شخص بے اصول زندگی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ اِس حقیقت کو پالے گا کہ موت دراصل خالق کے سامنے حاضری کا دن ہے۔ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ابدی مخلوق ہے، لیکن اس کی مدتِ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے— موت سے قبل کی مدتِ حیات (pre-death period)، اور موت کے بعد کی مدتِ حیات (post-death period)۔ موت سے پہلے کی مدتِ حیات امتحان (test) کے لیے ہے، اور موت کے بعد کی مدتِ حیات اُس کے سابقہ ریکارڈ کے مطابق، انعام یا سزا پانے کے لیے۔

انسان آج اپنے آپ کو اِس دنیا میں ایک زندہ اور باشعور وجود کی صورت میں پاتا ہے۔ یہ زندہ اور باشعور وجود ایک مستقل وجود ہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ یہ زندہ اور باشعور وجود اپنی اِسی موجودہ صورت میں عارضی دنیا سے نکالا جاتا ہے اور اس کو اِسی زندہ اور باشعور وجود کی حالت میں اگلی مستقل دنیا کی طرف منتقل (transfer) کردیا جاتا ہے۔

یہ لمحہ ہر عورت اور مرد پر لازماً آنے والا ہے۔ وہ ناقابلِ قیاس حد تک سنگین لمحہ ہوگا۔ موت کے بعد آنے والے اِس دورِ حیات میں یہی موجودہ انسان ہوگا، لیکن اس کے تمام اسباب اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ چکے ہوں گے۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جو اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی، اور اس کے آگے وہ دنیا ہوگی جہاں اس کو کامل بے سروسامانی کے ساتھ ابدی طور پر رہنا ہے— دانش مند وہ ہے جو اِس آنے والے دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔

انسان کی کہانی

حیوانات کے لیے زندگی صرف ایک بار ہے مگر انسان کے لیے استثنائی طور پر زندگی دو بار ہوتی ہے۔ ہر انسان اصلاً ابدی حیات کا مالک ہے۔ اِس ابدی زندگی کا بہت مختصر حصہ قبل از موت دورِ حیات میں ہے۔ اور اس کا بقیہ تمام حصہ بعد از موت دورِ حیات میں۔

کائنات کی دوسری چیزیں قانون فطرت کے ماتحت ہیں۔ یہاں کی ہر چیز جبری طور پر وہی کرتی ہے جو اس کے لیے قانونِ فطرت کے تحت مقدر کر دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ انسان استثنائی طور پر ایک آزاد مخلوق ہے۔ وہ اپنا مستقبل خود اپنے آزاد ارادے کے تحت بناتا ہے۔ وہ اپنی آزادی کا یا تو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط استعمال۔ وہ اپنے مواقع کو یا تو پاتا ہے یا اس کو نادانی کے ساتھ کھو دیتا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں خدا نے یہ اعلان کیا ہے: ہم نے انسان کو بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے درجے میں پھینک دیا (التین: 5-4)

We created man in the best mould, then we cast him down to the lowest of the low.

یہ گویا انسان کے لیے ایک وارننگ ہے جو اس کو اس کے حال اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اعلیٰ امکانات کے ساتھ پیدا کیا، مگر انسان اپنے امکانات کا کمتر استعمال کر کے اپنے آپ کو بدترین ناکامی میں ڈال دیتا ہے:

God created man with great potential, but by under-utilizing his potential he makes himself a worst case of failure.

انسان کی شخصیت ایک دوہری شخصیت ہے — جسم اور روح (یا ذہن)۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک انسان کے جسم کا تعلق

ہے، وہ غیر ابدی ہے۔ جب کہ انسان کی روح ایک ابدی وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کی روح ایک غیر مادّی حقیقت ہے۔ وہ مادّی قوانین سے بالاتر ہے۔ جب کہ انسان کا جسم مادی قوانین کے ماتحت ہے اور مسلسل طور پر فنا پذیر ہے۔

حیاتیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم بہت چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیات ہر لمحہ ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسان کا نظامِ ہضم گویا ایک خلیہ ساز فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹری مسلسل طور پر خلیّات کی سپلائی کرتی رہتی ہے۔ اِس طرح جسم اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ یہ عمل اِس طرح ہوتا ہے کہ ہر چند سال کے بعد آدمی کا جسم بالکل ایک نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا روحانی وجود کسی تبدیلی کے بغیر اسی طرح باقی رہتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ انسان کی شخصیت تغیر کے درمیان عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

انسان کی ناکامی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے غیر متغیر حصے کو نظر انداز کرتا ہے، اور اپنی شخصیت کے تغیر پذیر حصے کو اچھا بنانے میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ فانی انسان کی بہتری میں لگا دیتا ہے، اور ابدی انسان کی بہتری کے لیے وہ نہ کچھ سوچتا ہے اور نہ کچھ کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک محدود مدت گذار کر جب وہ مرتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا فانی وجود اپنی تمام ظاہری ترقیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے اور اس کا ابدی وجود ترقیات سے محروم حالت میں زندگی بعد موت کے مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں انسان کی ناکامی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہہ بدترین ناکامی ہے کہ انسان انتہائی اعلیٰ امکانات (potentials) کے ساتھ پیدا کیا جائے مگر وہ اپنے امکانات کو صرف ناقص طور پر استعمال کرے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اپنے اِس عدم استعمال کی قیمت دینے کے لیے اپنے ابدی دورِ حیات میں داخل ہوجائے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان استثنائی طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تصوّراتی فکر

(conceptual thought) انسان کی ایک ایسی صفت ہے جو وسیع کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں پائی جاتی۔حتی کہ حیوانات میں بھی نہیں۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا حیوان ہے:

Man is a thinking animal.

اِس اعتبار سے دیکھیے تو انسان کی شخصیت دو چیزوں پر مشتمل ہے— غیر تفکیری جسم، اور تفکیری روح۔ جو لوگ اپنے امکانات کو محدود طور پر صرف مادّی دائرے میں استعمال کریں وہ گویا اپنے وجود کے غیر تفکیری حصے کی تو خوب تزئین کر رہے ہیں لیکن اپنے وجود کے تفکیری حصے کی ترقی کے لیے وہ کچھ نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ موت سے پہلے کی اپنی تمام عمر جسمانی ترقی (physical development) میں صرف کر دیتے ہیں، اور جہاں تک ذہنی ترقی (intellectual development) کی بات ہے وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں پر جب موت آتی ہے تو اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اُسی طرح مر جاتے ہیں جس طرح کوئی حیوان مرتا ہے، یعنی اپنے جسم کو خوب فربہ بنانا، اور اگلے دورِ حیات میں اِس طرح داخل ہونا کہ ان کا ذہن تمام ترقیوں سے محروم ہو اور اگلے دورِ حیات میں طویل حسرت کے سوا کچھ اور ان کے حصے میں نہ آئے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کائنات کی تمام چیزیں، بشمول حیوانات، صرف اپنے آج (today) میں جیتے ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو کل کا شعور رکھتا ہے، اور کل کو نشانہ بنا کر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ گویا کہ بقیہ چیزیں صرف حال (present) میں جیتی ہیں اور انسان استثنائی طور پر مستقبل (future) میں۔

قرآن کے بیان کے مطابق، وہ لوگ بدترین محرومی کا شکار ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو صرف آج کی چیزوں کے حصول میں لگا دیں اور اپنے کل کی تعمیر کے لیے وہ کچھ نہ کریں۔ ایسے لوگ موت سے پہلے کی زندگی میں بظاہر خوش نما دکھائی دے سکتے ہیں لیکن موت کے بعد کی زندگی میں وہ محرومی کی بدترین مثال بن جائیں گے۔ کیوں کہ موت کے بعد کی زندگی میں جو چیز کام آنے والی ہے، وہ ذہنی اور روحانی ترقی ہے نہ کہ دنیوی مفہوم میں مادّی ترقی۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر لامحدود خواہشات رکھتا ہے۔ اِسی کے ساتھ ہر انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کو استعمال کر کے وہ لامحدود حد تک اپنی خواہشوں کی تکمیل کرے، مگر ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا صرف اتنا استعمال کر پاتا ہے جو اس کو موت سے پہلے کی محدود دنیا میں کچھ وقتی راحت دے سکے۔ مگر آخر کار ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِن تمام صلاحیتوں کو لیے ہوئے موت کے بعد والی ابدی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر بے راحت زندگی گذارے، کیوں کہ اُس نے اِس دوسرے دورِ حیات کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کیا تھا۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے حقیقت پسندانہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اِس طرح کرے کہ اس کی فطری صلاحیتیں بھر پور طور پر اس کے ابدی مستقبل کی تعمیر میں استعمال ہوں۔ وہ اپنے امکانات (potentials) کو سمجھے اور اُن کو اِس طرح استعمال کرے کہ وہ اپنے ابدی دورِ حیات میں ان کا مفید نتیجہ پا سکے۔ وہ اپنے آپ کو اِس بُرے انجام سے بچائے کہ آخر میں اس کے پاس صرف یہ کہنے کے لیے باقی رہے کہ میں اپنے امکانات کو استعمال کرنے سے محروم رہا:

I was a case of missed opportunities.

انسان کے لیے حقیقت پر مبنی منصوبہ بندی یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں مادی چیزوں کے معاملے میں صرف ضرورت (need) پر قناعت کرے، اور اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کا بیش تر حصہ اِس پر خرچ کرے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی میں ایک مُطہَّر شخصیت (purified personality) کے ساتھ داخل ہو۔ تا کہ اس کو ابدی دورِ حیات کی معیاری دنیا (perfect world) میں عزت اور راحت کی مطلوب زندگی مل سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ موت سے پہلے کے دورِ حیات اور موت کے بعد کے دورِ حیات دونوں میں کامیابی کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنے آپ کو تیّار شخصیت (prepared personality) بنانا۔ مادّی معنوں میں تیار شخصیت موت سے پہلے کے دورِ حیات میں ترقی کا ذریعہ

بنتی ہے، اور روحانی معنوں میں تیار شخصیت اُس دورِ حیات میں کام آئے گی جہاں موت کے بعد آدمی کو رہنا ہے۔

مادی معنوں میں تیار شخصیت یہ ہے کہ آدمی پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرے۔ آدمی کے اندر تجارتی صلاحیت ہو۔ آدمی کے اندر وہ صفات ہوں جن کے ذریعے کوئی شخص لوگوں کے درمیان مقبول ہوتا ہے۔ آدمی قریبی مفاد (immediate gain) کو آخری حد تک اہمیت دیتا ہو، وغیرہ۔

موت کے بعد کے دورِ حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو تیار شخصیت درکار ہے وہ ایسی شخصیت ہے جس نے موجودہ دنیا کے مواقع کو روحانی ارتقاء (spiritual development) اور فکری ارتقاء (intellectual development) کے لیے استعمال کیا۔ ایسی ہی شخصیت موت کے بعد کے دورِ حیات میں باقیمت ٹھہرے گی۔

یہ شخصیت وہ ہے جس نے اپنی عقل کو استعمال کر کے سچائی کو دریافت کیا۔ جو شبہات کے جنگل میں یقین پر کھڑا ہوا۔ جس نے خدا کو اپنی زندگی کا واحد کنسرن بنایا۔ جس نے خود پسندی کے جذبات کو کچل کر خدا پرستی کے طریقے کو اختیار کیا۔ جو منفی حالات میں مثبت سوچ پر قائم رہا۔ جس نے نفسانی انسان بننے کے بجائے ربّانی انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ جس نے مفاد پرستی کے بجائے اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ جس نے اپنے آپ کو نفرت سے بچایا اور اپنے اندر انسانی خیر خواہی کے جذبات کی پرورش کی۔ جس نے آزادی کے باوجود اطاعت (submission) کا طریقہ اختیار کیا۔

موت آدمی کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں سے نہ واپسی کی کوئی صورت ہے اور نہ تلافی کی کوئی صورت

زندگی کی حقیقت

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری دنیا جوڑے (pairs) کے اصول پر بنی ہے۔ یہاں ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے — الکٹران اور پروٹان، میل پلانٹ اور فی میل پلانٹ (male plant-female plant)، ہی اینمل اور شی اینمل (he animal-she animal) عورت اور مرد، اسی طرح خود یہ دنیا (world) جوڑے کی صورت میں ہے، نیگٹیو ورلڈ اور پازیٹیو ورلڈ۔

دنیا کا ایک جوڑا وہ ہے، جو آئیڈیل اور پرفیکٹ ہے۔ وہ ہر قسم کی محدودیت (limitations) سے پاک ہے۔ وہاں انسان کی تمام تمنائیں اپنی کامل صورت میں پوری ہوں گی۔ یہ کامل دنیا صرف منتخب لوگوں کو استحقاق (merit) کی بنیاد پر ملے گی۔ استحقاق کے بغیر کوئی اس دنیا میں داخلہ پانے والا نہیں۔

موجودہ دنیا اسی منصوبہ کا ابتدائی اور عارضی حصہ ہے۔ اس منصوبہ کے تحت، موجودہ دنیا انتخابی میدان (selective ground) کے طور پر بنائی گئی ہے۔ یہاں جو لوگ پیدا کئے جاتے ہیں، وہ اس لیے پیدا کئے جاتے ہیں، تاکہ یہاں کے حالات میں رکھ کر دیکھا جائے کہ ان میں سے کون اگلی کامل دنیا میں بسائے جانے کا اہل ہے اور کون اس کا اہل نہیں۔ اہل افراد کو منتخب کر کے اگلی کامل دنیا میں ہمیشہ کے لیے آباد کر دیا جائے گا اور بقیہ لوگ جو اس جانچ میں پورے نہیں اتریں گے وہ قابلِ رد (rejected lot) قرار پائیں گے۔

لوگوں کا یہ انتخاب (selection) کس بنیاد پر ہوگا۔ خالق کے منصوبہ کے مطابق، اس کی بنیاد صرف ایک ہے، وہ یہ کہ کس نے آزادی کا غلط استعمال کیا اور کس نے اس کا صحیح استعمال کیا۔ ملی ہوئی آزادی کا صحیح استعمال یا غلط استعمال ہی وہ واحد معیار ہے جس کے مطابق لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

خالق کے منصوبہ کے مطابق، صحیح انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو ماحول کی کنڈیشننگ سے

بچائے۔ جو خالق کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی گزارے، جو موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں، موت کے بعد کے مرحلۂ حیات کے مطابق، اپنے آپ کو تیار کرے۔

موجودہ دنیا میں ہر عورت اور مرد اسی جانچ (test) کی حالت میں ہیں۔ خالق کے منصوبہ کے مطابق ہر عورت اور مرد کا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ جب تاریخ کے خاتمہ پر انسان کا اگلا دور شروع ہوگا، اس وقت انسانوں کا خالق ظاہر ہو کر سامنے آجائے گا۔

یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ اس وقت تمام پیدا ہونے والے عورت اور مرد خالق کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ اس وقت خالق اپنے تیار کئے ہوئے ریکارڈ کے مطابق، ہر ایک کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ یہ فیصلہ تمام تر انصاف کی بنیاد پر ہوگا۔ اور پھر کسی کو ابدی جنت میں آباد کیا جائے گا اور کسی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ حالات بتاتے ہیں کہ یہ آنے والا دن بہت قریب آچکا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے جب کہ انسان جاگے اور آنے والے ابدی دورِ حیات کی تیاری کرے۔

نگاہ عبرت

رومن ایمپائر کے عروج کے زمانے میں اس کے اندر بیشتر یوروپ، شرق اوسط اور افریقہ کے شمالی ساحلی ممالک شامل تھے۔ رومیوں نے جو سڑکیں، عمارتیں اور پل بنائے، وہ اتنے شاندار تھے کہ ان کے بنائے ہوئے بعض پل اسپین میں دو ہزار بعد بھی آج تک باقی ہیں۔ رومن لا، آج بھی یوروپ، امریکہ کے قانون کی بنیاد ہے، وغیرہ۔ مگر رومن ایمپائر اپنی ساری عظمتوں کے باوجود ختم ہوگئی۔ اب اس کا نشان یا تو پرانے کھنڈروں میں ہے یا ان کتابوں میں جو لائبریریوں کی زینت بننے کے لیے رکھی جاتی ہیں۔

اس طرح کے واقعات سے انسان اگر نصیحت لے تو وہ کبھی گھمنڈ میں مبتلا نہ ہو۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ آنکھ والا وہ ہے جو اپنے عروج میں زوال کا منظر دیکھے، جو اپنی بلند عمارتوں کو پیشگی طور پر کھنڈر ہوتا دیکھ لے۔

انسانی شخصیت

کیمسٹری کا پہلا سبق جو ایک طالب علم سیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی صورت بدل لیتی ہے:

Nothing dies, it only changes its form.

اس عالمی کلیہ سے انسان کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح مادہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ جلنے یا پھٹنے یا کسی اور حادثہ سے وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ شکل بدل کر دنیا کے اندر اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم مجبور ہیں کہ انسان کو بھی نا قابل فنا مخلوق سمجھیں اور موت کو اس کے خاتمہ کے ہم معنیٰ قرار نہ دیں۔

یہ محض بالواسطہ قیاس نہیں بلکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو براہ راست تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر علم الُخلِیَّہ (cytology) بتاتا ہے کہ انسان کا جسم جن چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے مل کر بنا ہے وہ مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ایک متوسط قد کے انسان میں ان کی تعداد تقریباً ۲۶ ٹریلین ہوتی ہے۔ یہ کسی عمارت کی اینٹوں کی طرح نہیں ہیں جو ہمیشہ وہی کے وہی باقی رہتے ہوں۔ بلکہ وہ ہر روز بے شمار تعداد میں ٹوٹتے ہیں اور غذا ان کی جگہ دوسرے تازہ خلیات فراہم کرتی رہتی ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ ظاہر کرتی ہے کہ اوسطاً ہر دس سال میں ایک جسم بدل کر بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ گویا دس برس پہلے میں نے اپنے جس ہاتھ سے کسی معاہدہ پر دستخط کئے تھے وہ ہاتھ اب میرے جسم پر باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ''پچھلے ہاتھ'' سے دستخط کیا ہوا معاہدہ میرا ہی معاہدہ رہتا ہے۔ جسم کی تبدیلی کے باوجود اندر کا انسان پہلے کی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے۔ اس کا علم، اس کا حافظہ، اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں، اس کے خیالات بدستور اس کی ہستی میں شامل رہتے ہیں۔ اسی لئے ایک حیاتیاتی عالم نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت تغیر کے اندر عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

عمر اور صحت

ایک صاحب میرٹھ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ تقریباً 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ پہلی بار جب میں اُن سے ملا تھا تو بظاہر وہ بالکل تندرست اور صحت مند نظر آتے تھے۔ بعد کو اُنھیں کینسر کی بیماری ہوگئی۔ علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ صاحب فراش ہوگئے۔ آخری زمانے میں اُن کا حال یہ تھا کہ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن چکے تھے۔ ان کا نظامِ ہضم اتنا زیادہ بگڑ چکا تھا کہ سادہ غذا بھی وہ نہیں لے سکتے تھے، حتی کہ پانی پینا بھی اُن کے لیے سخت مشکل ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں کوئی شخص ان کی عیادت کے لیے آتا تو وہ اُس سے کہتے کہ تم میرے بارے میں نہ سوچو، بلکہ خود اپنے بارے میں سوچو۔ تم شکر کرو کہ تم کو صحت مند جسم حاصل ہے۔ تم کھانا کھاتے ہو اور پانی پیتے ہو اور زمین پر چلتے ہو۔ یہ سب چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔ وہ جب چاہے، اِس عطیہ کو چھین لے اور پھر تمھارے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔

انسان کو ایک صحت مند جسم ملا ہوا ہے۔ انسان کو پیدا ہونے کے بعد یہ صحت مند جسم بظاہر اپنے آپ مل جاتا ہے، اِس لیے وہ اُس کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لے لیتا ہے۔ وہ کبھی سوچتا نہیں کہ یہ صحت مند جسم سرتاسر خدا کا عطیہ ہے۔ اِس عطیہ کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خدا کے آگے جھک جانا چاہیے۔ یہی معاملہ عمر کا ہے۔ آدمی جب تک زندہ ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی یہ زندگی ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ کبھی اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ یہ بلا شبہ سب سے بڑی بھول ہے۔

یہی ہر عورت اور ہر مرد کا امتحان (test) ہے۔ کامیاب شخص وہ ہے جو زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے، جو ہر ملی ہوئی چیز کو خداوندِ عالم کا عطیہ سمجھے۔ یہی وہ انسان ہے جو امتحان میں کامیاب ہوا۔ اِس کے برعکس، جو انسان خدا کا اعتراف نہ کرے اور موت کو بھلائے ہوئے ہو، وہی وہ شخص ہے جو امتحان میں ناکام ہوگیا۔ پہلے انسان کے لیے ابدی جنت ہے اور دوسرے انسان کے لیے ابدی جہنم۔

بڑھاپے کی عمر

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ (35: 37)
۔یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو شخص یاد دہانی حاصل کرنا چاہے، وہ اس میں یاد دہانی حاصل کر سکے۔ اِس مفہوم کی متعدد روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو، ابن حجر کی فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من بلغ ستین سنۃ۔

حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی کو لمبی عمر یا بڑھاپے کی عمر ملے، اس کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ آدمی کے اوپر پہلے بچپن کا دور آتا ہے، اس کے بعد جوانی کا دور آتا ہے، اس کے بعد بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ بڑھاپے کا دور موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے آخری دور ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے، وہ موت کا مرحلہ ہے، نہ کہ کوئی اور مرحلہ۔

اِس اعتبار سے بڑھاپا گویا کہ موت کی پیشگی اطلاع (prior notice) کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑھاپے میں جسم کے تمام اعضا (organs) کمزور ہو جاتے ہیں، حتی کہ بعض اعضا اپنا کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ موت کا وقت قریب آ گیا۔ وہ گویا کہ موت کی جبری یاد دہانی (compulsory reminder) ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو قبر کے کنارے کھڑا کر دیتا ہے۔

اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر وہ سوچنے لگے گا کہ اب بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب کہ میری موت واقع ہو اور میں اللہ کے سامنے حساب کتاب کے لیے حاضر کر دیا جاؤں۔ اِس طرح بڑھاپے کے تجربات آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں، وہ اس کو آخرت کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں تمھارا سفر اب ختم ہو چکا۔ اب تمھیں لازماً اگلے دورِ حیات میں داخل ہونا ہے اور حشر کی خدائی عدالت کا سامنا کرنا ہے — بلا شبہ وہ انسان سب سے زیادہ بدبخت انسان ہے جس کو بڑھاپے کا زمانہ ملا، لیکن وہ اس سے یاد دہانی حاصل نہ کر سکا، وہ بدستور غفلت میں رہا، یہاں تک کہ وہ اِسی حال میں مر گیا۔

بڑھاپے سے سبق لینا

انسانی زندگی کا ایک ظاہرہ وہ ہے جس کو بڑھاپا کہا جاتا ہے۔ بڑھاپا کوئی غیر مطلوب چیز نہیں۔ بڑھاپے کی عمر میں انسان کے لئے ایک موقع موجود ہوتا ہے، یعنی نصیحت لینا۔ قرآن کی سورہ الفاطر میں یہ بات ان الفاظ میں آئی ہے: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ (35:37) یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا۔

انسان اس دنیا میں محدود عمر کے لئے آتا ہے۔ چناں چہ پیدا ہوتے ہی انسان کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوجاتا ہے۔ تقریباً 35 سال تک اس کا گراف اوپر کی طرف جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ نیچے جانا شروع ہوتا ہے۔ ادھیڑ عمر، بڑھاپا، آخر میں موت۔ اس درمیان میں اس کو مختلف قسم کے نقصان پیش آتے ہیں۔ مثلاً بیماری، حادثہ، طرح طرح کے مسائل، وغیرہ۔

اس طرح آدمی سے ایک ایک چیز چھنتی رہتی ہے۔ پہلے جوانی، پھر صحت، پھر سکون، وغیرہ۔ یہاں تک کہ موت کا وقت آتا ہے۔ اور آدمی کی ہر وہ چیز، جس کو وہ اپنا سمجھتا تھا، یہاں تک کہ اس کا اپنا جسمانی وجود بھی اس سے چھن جاتا ہے۔ اس کے بعد جو چیز باقی رہتی ہے وہ صرف انا (ego) ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت کا تجربہ کسی انسان کے لئے سب سے زیادہ سنگین تجربہ ہے۔ اس تجربہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے قبل از موت مرحلۂ حیات میں جو کمایا تھا وہ اس سے ابدی طور پر چھن گیا۔ اِس کے آگے بعد از موت مرحلۂ حیات کا معاملہ ہے۔ اس دوسرے مرحلہ میں آدمی کو صرف وہ چیز کام آئے گی جو اس نے عمل صالح کی صورت میں اپنے آگے کے لئے بھیجی۔ اس حقیقت کو قرآن کی سورہ الحشر میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18) یعنی اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیجا۔ بڑھاپا برائے سبق ہے، بڑھاپا برائے شکایت نہیں۔

بڑھاپا آنے سے پہلے

فطرت کے قانون کے مطابق، انسان اپنی عمر کے تقریبا چالیس سال تک بڑھاپے سے پہلے کے دور میں ہوتا ہے۔ چالیس سال کے بعد اس کے اوپر عملاً بڑھاپے کا دور شروع ہوجاتا ہے، جو قانون فطرت (law of nature) کے تحت کسی بھی وقت اُس کو اِس دنیا سے جدا کردینے والا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

یہ اصول زیادہ بہتر طور پر انسان کی عمر کے معاملے میں چسپاں (apply) ہوتا ہے۔ یعنی ہر انسان کو چاہیے کہ بڑھاپے سے پہلے کے دورِ حیات میں وہ اپنے آپ کو آخرت کے لیے تیار کرلے۔ کیوں کہ بڑھاپے کے بعد کے دورِ حیات میں کسی کے لیے یہ موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ آخرت کے لیے مطلوب قسم کی تیاری کرسکے۔

تاہم چالیس سال کے بعد کسی انسان کے لیے عمر کا جو دور آتا ہے، وہ اس کی زندگی کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ اس دور میں وہ زیادہ سنجیدہ ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر پختگی (maturity) آجاتی ہے۔ اس کا ذہنی ارتقا (intellectual development) اپنی تکمیل کے دور میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کو ایسے تجربات (experiences) حاصل ہوجاتے ہیں، جو اس کی صحیح طرزِ فکر کے لیے رہنما بن سکیں۔

چالیس سال کے بعد کسی انسان کی زندگی میں جو دور آتا ہے، وہ اس کے لیے آخرت کی تیاری کا بہترین دور ہوتا ہے۔ اب عملاً وہ فطری انسان (man cut to size) بن چکا ہوتا ہے۔ اب اس کے پاس زیادہ تیار ذہن (prepared mind) ہوتا ہے، جس کی روشنی میں وہ زیادہ درست طور پر اپنے مستقبل کا نقشہ بنا سکے۔ چالیس سال کے بعد کی عمر میں زیادہ ممکن ہوجاتا ہے کہ آدمی بے خطا انداز میں اپنے آپ کو آخرت کے لیے تیار کرسکے — دانش مند وہ ہے جو اپنے اس حصۂ عمر کو استعمال کرے، اور غیر دانش مند وہ ہے جو اپنے اس حصۂ عمر کو استعمال کیے بغیر کھودے۔

ہر شخص موت کا مسافر

ایک خبر میڈیا میں آئی ہے۔ٹائمس آف انڈیا میں یہ خبر حسب ذیل الفاظ میں چھپی ہے:

British reality TV star Jade Goody, who has been diagnosed with cancer, says she has started planning for her funeral, adding she wants"people to cry over me". "Most people plan their weddings. But I am planning my funeral", Goody told OK Magazine. Goody was diagnosed with cervical cancer in August 2008 just as she prepared to appear in the Indian version of the British reality TV show celebrity Big Brother. (New Delhi, 9th Oct 2008. p. 21)

برطانی ٹی وی اسٹار جیڈ گوڈی اپنے پروفیشن کے اعتبار سے چوٹی (peak) پر تھیں۔ اچانک اگست 2008 کے طبی معائنے میں اُن کو بتایا گیا کہ اُن کو کینسر کی بیماری ہو چکی ہے، یعنی لاعلاج بیماری۔ انھوں نے اپنے مستقبل کے پروفیشنل منصوبوں کو منسوخ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب مجھے موت کی تیاری کرنی ہے۔ لوگ شادی کا منصوبہ بناتے ہیں، مجھ کو اپنی موت کا منصوبہ بنانا ہے:

Most people plan their weddings. But I am planning my funeral.

یہی ہر عوت اور ہر مرد کی کہانی ہے۔ لوگ زندگی کا جشن منانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں، حالاں کہ ہر ایک کا آخری انجام یہ ہے کہ جشن کی تکمیل سے پہلے اُس پر موت آئے اور وہ موجودہ دنیا سے نکل کر اگلی دنیا میں پہنچ جائے۔ ایسی حالت میں ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ قبل از موت مرحلۂ حیات کو صرف ایک وقتی سفر سمجھے اور اپنی ساری توجہ بعد از موت مرحلۂ حیات کی تیاری میں لگا دے۔

لوگ اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں۔ حالاں کہ ہر سالگرہ صرف اِس بات کا اعلان ہے کہ آدمی کی عمر کا ایک سال اور کم ہو گیا۔ ایسی حالت میں، ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ہر سال کی تکمیل پر آنے والی موت کو یاد کرے۔ کیوں کہ اگلی سالگرہ کا آنا یقینی نہیں، لیکن موت کا آنا یقینی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اِس سب سے بڑی حقیقت کو یاد رکھے جس کا دوسرا نام موت ہے۔

موت

موت کیا ہے، موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ ہے۔ موت ''اپنی دنیا'' سے نکل کر ''دوسرے کی دنیا'' میں جانا ہے۔ کیسا چونکا دینے والا ہے یہ واقعہ۔ مگر انسان کی یہ غفلت کیسی عجیب ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، پھر بھی وہ نہیں چونکتا۔ حالاں کہ ہر مرنے والا زبان حال سے دوسروں کو بتا رہا ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا یہی تمھارے اوپر بھی گزرنے والا ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ کامل بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو فرشتوں کے حوالہ کر دے۔ موت ہر آدمی کو اسی آنے والے دن کی یاد دلاتا ہے۔ موت کا حملہ سراسر یک طرفہ حملہ ہے۔ یہ طاقت اور بے طاقتی کا مقابلہ ہے۔ اس میں انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کامل عجز کے ساتھ فریقِ ثانی کے فیصلہ پر راضی ہو جائے۔ وہ یک طرفہ طور پر شکست کو قبول کر لے۔

موت انسانی زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدّ فاصل ہے۔ موت آدمی کو موجودہ دنیا سے اگلی دنیا کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے۔ یہ امتحان کے بعد اس کا انجام پانے کے دور میں داخل ہونا ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ معقولیت کے آگے جھکنے پر راضی نہیں ہوتا۔ موت اس لیے آتی ہے کہ اس کو بے یار و مددگار کر کے حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے۔ جس صداقت کو اس نے باعزت طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کو وہ بے عزّت ہو کر قبول کرے۔ جس حق کے آگے، وہ اپنے ارادہ سے نہیں جھکا تھا۔ اس حق کے آگے مجبورانہ طور پر جھکے اور اس کی تردید کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ انسان آج حق کی تائید میں چند الفاظ بولنا گوارا نہیں کرتا، جب موت آئے گی تو وہ چاہے گا کہ ڈکشنری کے سارے الفاظ حق کی موافقت میں استعمال کر ڈالے، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے الفاظ کو سنے۔ انسان آج ڈھٹائی کرتا ہے، موت جب اس کو پچھاڑے گی تو وہ سراپا عجز و نیاز بن جائے گا۔ مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے عجز و نیاز کی قدر دانی کرے۔

موت کا شعور

لوگ دیکھتے ہیں کہ ہر پیدا ہونے والا محدود مدت کے بعد مر جاتا ہے۔ اِس کے باوجود یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص خود اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، مگر خود اپنی موت کے بارے میں وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ڈی این اے (DNA) کی دریافت اِس سوال کا جواب ہے۔ یہ ایک نئی سائنس ہے۔ اِس پر دنیا کے بڑے بڑے دماغوں نے کام کیا ہے۔ اِس میں انڈیا کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ہر گوبند کھورانا (وفات 2011) کا نام بھی شامل ہے۔ اِس جدید تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر انسان کے جسم میں تقریباً ایک سو ٹریلین سیل (living cells) ہوتے ہیں۔ ہر سیل کے نیوکلیس میں ایک ناقابلِ مشاہدہ ڈی این اے موجود رہتا ہے۔ ڈی این اے کے اندر انسانی شخصیت کے بارے میں تمام چھوٹی بڑی معلومات کوڈ کی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ یہ معلومات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اگر اُن کو ڈی کوڈ (decode) کیا جائے، تو وہ برٹانکا جیسی ضخیم انسائکلو پیڈیا کے ایک ملین سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوں گی:

One human DNA molecule contains enough information to fill a million-page encyclopaedia.

ڈی این اے کے اندر انسانی شخصیت کے بارے میں تمام معلومات درج ہوتی ہیں، مگر اِس فہرست میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ موت ہے۔ ڈی این اے کی طویل فہرست موت کے تصور سے خالی ہے۔ موت کا تصور انسانی شخصیت (human consciousness) میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، لیکن وہ خود اپنی موت کے بارے میں سوچ نہیں پاتا۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ موت کسی شخص کے اوپر ڈی این اے کی پروگریمنگ کے تحت نہیں آتی، بلکہ وہ براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آتی ہے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے اندر اینٹی پروگریمنگ سوچ پیدا کرے۔ وہ خدائی فیصلے کی نسبت سے موت کے معاملے کو دریافت کرلے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

موت کے دروازے پر

آدمی سمجھتا ہے کہ وہ زندگی میں جی رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد موت کے دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ جب موت کا کوئی وقت مقرر نہیں تو ہر لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ انسان کا ہر اگلا قدم موت کی طرف جانے والا قدم ہے۔ زندگی ہر انسان کے لیے صرف آج کا تجربہ ہے، کل کا تجربہ نہیں۔ ہر آدمی کے لیے آج کا دن زندگی کا دن ہے اور کل کا دن موت کا دن۔

موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف سفر کا نام ہے۔ آدمی روزانہ سفر کرتا ہے۔ کبھی چھوٹا سفر اور کبھی بڑا سفر، کبھی ملک کے اندر سفر اور کبھی ملک کے باہر سفر۔ یہ تمام اسفار ایک معلوم مقام سے چل کر دوسرے معلوم مقام تک جانے کے ہم معنی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سفروں سے آدمی اتنا زیادہ مانوس ہو چکا ہے کہ وہ اس کو کوئی سنگین چیز نہیں سمجھتا۔

لیکن موت کے سفر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ موت کے سفر میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک معلوم دنیا سے نکل کر دوسری نامعلوم دنیا کی طرف جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ ہر آدمی کے لیے ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے۔ مگر آدمی اپنی کنڈیشننگ کی وجہ سے اس کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں جن اسفار کا تجربہ کرتا ہے، ان سے وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ گہرے شعور کے تحت، موت کے سفر جیسے سفر کا ادراک نہیں کر پاتا۔ اسی بنا پر ہر آدمی کے لیے موت ایک دور کی خبر بنی ہوئی ہے، وہ اس کے لیے قریب کا کوئی واقعہ نہیں۔

آدمی اپنے مزاج کی بنا پر ہمیشہ کنڈیشننگ کے تحت سوچتا ہے۔ یہی انسان کی بے حسی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ موت کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی کنڈیشننگ کو توڑے، وہ اپنے مانوس ذہن سے باہر آ کر موت کے بارے میں سوچے، وہ اپنے شعور کو کامل طور پر بیدار کرے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آدمی موت کی حقیقت کو سمجھے، جو بلاشبہ ہر انسان کا سب سے زیادہ سنگین معاملہ ہے۔

وقت ختم ہو گیا

اسکول میں طالب علموں کا امتحان ہو رہا تھا۔ طلبہ میز پر جھکے ہوئے اپنا اپنا سوال حل کر رہے تھے، یہاں تک کہ امتحان کا مقرر وقت پورا ہو گیا۔ فوراً ہی امتحان حال میں موجود ذمّے داروں کی طرف سے اعلان کیا گیا— لکھنا بند کرو، وقت ختم ہو گیا:

Stop writing, time is over.

یہ معاملہ جو امتحان ہال میں پیش آیا، وہی وسیع تر زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ اِس دنیا میں ہر عورت اور ہر مرد ایک بڑے امتحان ہال میں ہیں۔ یہاں ہر ایک اپنا اپنا امتحان دے رہا ہے۔ ہر ایک کی ایک مدت مقرر ہے۔ یہ مدت پوری ہوتے ہی خدا کا فرشتہ آتا ہے اور خاموش زبان میں اعلان کرتا ہے کہ تمھارے عمل کا وقت ختم ہو گیا۔ اب تم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے خالق و مالک کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے۔ تعلیمی امتحان کا معاملہ جو ہر طالب علم کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ ایک مثال ہے جس سے ہر عورت اور ہر مرد وسیع تر معنوں میں زندگی کے امتحان کے معاملے کو سمجھ سکتے ہیں۔ زندگی حالتِ امتحان کا نام ہے، اور موت اِس کا نام ہے کہ آدمی کو اپنے عمل کا انجام پانے کے لیے اگلی دنیا میں بھیج دیا جائے۔ موت سے قبل کی زندگی دراصل امتحان کا دور ہے اور موت کے بعد کی زندگی امتحان کا رزلٹ نکلنے کا دور۔ جو شخص امتحانی دورِ حیات میں ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزارے گا، وہی اگلے دورِ حیات میں بہتر انجام کو پائے گا۔ جو لوگ اِس معاملے میں غافل ثابت ہوں، اُن کو بعد کے دورِ حیات میں حسرت اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔

امتحان ہال کے اندر ایک طالب علم جس نفسیات کے ساتھ رہتا ہے، اُسی نفسیات کے ساتھ ہم کو اپنی پوری زندگی میں رہنا ہے۔ ہر ایک کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے دیے ہوئے پرچے کو درست طور پر حل کرے، تاکہ امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد جب اُس کا رزلٹ سامنے آئے تو وہ اُس کے لیے کامیابی کی خوش خبری ہو، نہ کہ ناکامی کا اعلان۔

موت کی خبر

ایک شخص کی عمر 75 سال ہوگئی۔ ابتدائی عمر میں اس کی صحت اچھی تھی۔ اب اُس کو بیماریاں لگ گئیں۔ یہ بیماری اس کے لیے موت کی خبر تھی۔ لیکن اس نے بیماری کو صرف علاج کا معاملہ سمجھا۔ اس نے مختلف ڈاکٹروں اوراسپتالوں سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ جب اس کا ذاتی سرمایہ ختم ہو گیا تو اس نے قرض لے کر اپنا مہنگا علاج شروع کر دیا۔ لیکن اس کو دوبارہ صحت حاصل نہ ہوسکی۔ چند سال بیمار رہ کر وہ مرگیا— یہ ایک انسان کی کہانی نہیں ہے، بلکہ یہی تقریباً تمام عورت اور مرد کی کہانی ہے۔

بڑھاپا ہر آدمی کے لیے اِس بات کی خبر ہوتا ہے کہ موت قریب آ گئی۔ اِس کے بعد جب اس کو بیماریاں لگتی ہیں تو وہ آدمی کو مزید جھنجھوڑنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ اِس لیے ہوتی ہیں کہ آدمی اگر سورہا ہے تو وہ جاگ جائے۔ اوراگر وہ جاگ گیا ہے تو وہ اٹھ جائے۔ اوراگر وہ اٹھ گیا ہے تو وہ چلنے لگے۔ بڑھاپا اور بڑھاپے کے بعد آنے والی کم زوری اور بیماری ہمیشہ اِس لیے آتی ہے کہ آدمی چونک اُٹھے۔ وہ موت سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگے۔ وہ موت کے بعد آنے والے حالات پر سوچے اوراس کے مطابق، اپنی زندگی کی آخری منصوبہ بندی کرے۔

لیکن انسان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ بڑھاپااور بیماری اُس کو موت کی خبر دیتے ہیں، لیکن وہ موت کے بارے میں سوچنے کے بجائے صرف علاج کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے پیچھے دوڑتا ہے، یہاں تک کہ وہ ناامیدی کے ساتھ مرجاتا ہے۔ دوبارہ جو چیز اُس کو ملتی ہے، وہ تندرستی نہیں ہے، بلکہ موت ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر آدمی روزانہ اپنے آس پاس کے ماحول میں دیکھتا ہے، لیکن کوئی آدمی اُس سے سبق نہیں لیتا۔ اِس معاملے میں ہر آدمی اندھا بنا ہوا ہے۔ وہ صرف اِس انتظار میں ہے کہ موت اس کی آنکھ کھولے۔ لیکن موت کے بعد آنکھ کا کھلنا، کسی عورت یا مرد کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

تیاری کا دور

موت (death) کے لفظ کو اگر آپ ڈکشنری میں دیکھیں تو اس میں موت کا مطلب یہ لکھا ہوا ہوگا کہ — زندگی کا ابدی خاتمہ:

Permanent cessation of life

موت کی یہ لغوی تعریف، موت کی منفی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ آدمی مکمل انسان کی حیثیت سے پیدا ہو، لیکن تھوڑی مدت تک زندہ رہ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اس کی تمام آرزوئیں (desires) اور اس کی تمام صلاحتیں اِس طرح مٹ جائیں کہ دوبارہ اُن کا وجود میں آنا ممکن نہ رہے۔

اسلام اِس کے مقابلے میں، زندگی کا مثبت تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت کا مطلب انسان کے لیے اس کے دوسرے دورِ حیات کا آغاز ہے:

Death is not the end of life. Death marks the beginning of the second phase of human life.

اسلام کے مطابق، انسان کو ابدی مخلوق (eternal being) کے طور پر پیدا کیا گیا، پھر اس کے عرصۂ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا — قبل ازموت دور، اور بعد از موت دور۔ قبل ازموت عرصۂ حیات تیاری کی جگہ ہے اور بعد ازموت عرصۂ حیات تیاری کے مطابق، اپنا مستقل انجام پانے کی جگہ۔

اِس تخلیقی پلان کے مطابق، آدمی کو چاہیے کہ وہ موت سے پہلے کی زندگی کو تیاری کا دور (preparatory period) سمجھے اور اس کو کامل طور پر تیاری میں گزارے۔ کیوں کہ موت کے بعد زندگی کا جو دور آدمی کے سامنے آئے گا، اُس میں عمل کرنا نہ ہوگا، بلکہ صرف اپنے عمل کا انجام پانا ہوگا۔ موت کا واقعہ دراصل، ابدی زندگی کی تیاری کا پیغام ہے، اور وہ ہے — جو کرنا ہے، اُس کو آج کے دن کرلو۔ کیوں کہ کل کے دن کرنے کا وقت باقی نہیں رہے گا۔

موت کی حقیقت

قرآن کی سورہ آل عمران میں آیا ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ المَوْتِ (3: 185)۔یعنی ہر انسان موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔انسان دنیا کے ذائقوں میں جیتا ہے، مگر آخر کار جو ذائقہ انسان کے لیے مقدر ہے، وہ موت کا ذائقہ ہے۔موت کا ذائقہ اتنا زیادہ تلخ ہے کہ وہ دوسرے تمام ذائقوں کو منہدم کردینے والا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: أکثروا ذکر ھادم اللذات، الموت (سنن الترمذی، کتاب الزہد)۔یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

ذائقہ یا لذت کا لفظ یہاں کسی محدود معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ وسیع تر معنوں میں ہے۔آدمی ایک لذت پسند مخلوق (pleasure-seeking animal) ہے۔ہر چیز میں اس کو لذت محسوس ہوتی ہے۔کھانے پینے میں، اچھا کپڑا پہننے میں، اچھا گھر بنانے میں، اچھی سواریوں پر سفر کرنے میں، تفریح کی مجلسوں میں شریک ہونے میں، شہرت اور اقتدار کی سیٹ پر بیٹھنے میں، وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام چیزوں میں آدمی کو بے پناہ لذت ملتی ہے۔وہ اِن لذتوں میں گم ہوجاتا ہے۔لیکن اگر وہ حقیقتاً یہ سوچے کہ موت کے آتے ہی اچانک یہ تمام لذتیں اس سے چھن جائیں گی، تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔مثلاً جب کوئی شخص دوسرے انسان کی عیب زنی کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس کو یہ خوشی حاصل ہوتی ہے کہ میں ایک بے عیب انسان ہوں۔جب کوئی انسان کسی کو ذلیل کرتا ہے تو یہ اس کے لیے اس کی انا (ego) کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔کوئی شخص ناحق طور پر کسی کے مال وجائداد پر قبضہ کرتا ہے تو وہ اس کو اپنی ہوشیاری سمجھ کر اطمینان حاصل کرتا ہے۔

اِس قسم کی مختلف صورتیں ہیں جن پر عمل کرکے انسان کو خوشی اور فخر (pride) کا احساس ہوتا ہے۔وہ اپنے آپ کو کامیاب انسان سمجھ لیتا ہے۔لیکن اگر اس کو یقین ہو کہ موت کا فرشتہ کسی بھی وقت آئے گا، اور اچانک اس کی زندگی کا خاتمہ کردے گا، اِس حقیقت کا احساس اگر کسی کو حقیقی طور پر ہوجائے تو وہ محسوس کرے گا کہ موت سے پہلے ہی اس کی موت واقع ہوچکی ہے۔

موت کے قریب

2 فروری 2003 کو تمام دنیا کے اخباروں کی پہلی خبر صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ امریکا کا خلائی شٹل کولمبیا دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے (disintegrate) ہو گیا۔ یہ کولمبیا کا 28 واں خلائی سفر تھا۔ یہ امریکی شٹل (US space shuttle Columbia) اپنے 16 دن کے سفر کے بعد زمین پر اترنے والا تھا۔ وہ تقریباً دو لاکھ فٹ کی بلندی پر 19 ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک زمینی کنٹرول سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا اور وہ دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس وقت اس میں ۷ مسافر تھے جو سب کے سب مر گئے۔ اس خبر کا عنوان نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے — گھر سے صرف 16 منٹ دور:

Just 16 minutes from home...

میں نے اس خبر کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہی اس دنیا میں ہر انسان کا آخری انجام ہے۔ ہر انسان اپنا ایک خوابوں کا گھر (dream home) بناتا ہے جس میں وہ پُرمسرت زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لیکن ابھی وہ اس گھر سے صرف 16 منٹ دور ہوتا ہے کہ اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے دنیوی گھر میں داخلہ کے بجائے آخرت کی عدالت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس خلائی شٹل میں ایک ہندستانی نژاد خاتون کلپنا چاؤلہ (41 سال) بھی تھیں جو کرنال میں پیدا ہوئیں۔ سارا ہندستان ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے دوست اور رشتہ دار سفر کر کے امریکہ پہنچ چکے تھے تاکہ اسپیس شٹل کے اترنے کے بعد وہ کلپنا چاؤلا کو براہ راست مبارکباد دے سکیں۔ کلپنا چاؤلہ اگر حفاظت کے ساتھ واپس آگئی ہوتیں تو ان کا ہیروانہ استقبال ہوتا۔ مگر موت نے درمیان میں حائل ہو کر ایک طربیہ (comedy) کو ایک المیہ (tragedy) میں تبدیل کر دیا۔ یہ واقعہ کلپنا چاؤلہ کے لئے ایک ذاتی تجربہ تھا اور دوسروں کے لئے وہ ایک سبق۔ اس واقعہ کو جاننے والا وہی ہے جو اس کے اندر خود اپنی تصویر دیکھ لے، جو اس کے اندر اپنی ذات کے لئے سبق حاصل کر لے۔

موت کا تجربہ

مشہور ٹینس کھلاڑی مارٹینا (Martina Navratoliva) طبی مشورے کے لئے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ تمھارے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا ہے اور وہ اگلے اسٹیج میں ہے۔ ڈاکٹر کی تشخیص (diagnosis) کو بتاتے ہوئے مذکورہ خاتون نے کہا کہ یہ خبر میرے لیے نائن الیون کے برابر ہے:

It was such a shock for me. It was my 9/11.

خاتون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ موت اُس کو بالکل قریب دکھائی دینے لگی۔ لیکن موت کے بعد کا جو مرحلہ ہے، وہ اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ موت، قرآن کے الفاظ میں، اسباب کے کامل تقطّع (البقرۃ: 166) کا نام ہے۔ موت کے بعد اچانک آدمی ایک اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے جو موجودہ دنیا کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ موت کے بعد اچانک انسان پر دو سنگین حقیقتیں کھل جاتی ہیں — ایک یہ کہ اب موت سے پہلے والے دور میں واپسی ممکن نہیں، جہاں اس نے اپنی ایک دنیا بنائی تھی۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد والے دور میں وہ اپنے لیے ایک اور دنیا نہیں بنا سکتا۔ یہ احساس آدمی کو ابدی مایوسی اور ابدی حسرت میں مبتلا کر دے گا، اور بلاشبہہ ابدی مایوسی اور ابدی حسرت سے زیادہ اذیت ناک تجربہ اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں اگر ایک چانس کھویا جائے تو اس کے بعد اس کو دوسرا چانس (second chance) مل جاتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ جیت میں تبدیل کر سکے۔ لیکن آخرت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ آخرت میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدمی اپنے لیے دوسرا چانس پا لے۔ آخرت میں کسی انسان کے لیے دوبارہ کوئی چانس نہیں۔ پہلے چانس یا دوسرے چانس یا تیسرے چانس کا معاملہ صرف موجودہ دنیا میں پیش آتا ہے۔ آخرت کی دنیا مکمل طور پر اِس سے مختلف ہے۔ آخرت میں صرف انجام ہے، وہاں کسی کو دوبارہ نیا آغاز ملنے والا نہیں۔

موت کا سبق

میں ایک جنازہ میں شریک ہوا۔ موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا۔ اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر وہ میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے، یہاں تک کہ قبر میں احترام کے ساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ ''مٹی'' کے ساتھ ''انسان'' جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں۔ وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔ یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقرر دن میں کاغذ کا ایک انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لیے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

وہ کل ایک زندہ انسان تھا۔ مگر دھیرے دھیرے اس کے قدم جواب دے گئے۔ بولتے بولتے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی، وہ سب اچانک ختم ہو گئی۔ اب خدا اِس واقعہ کو استعمال کرتا ہے، تاکہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ وہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلائے۔ لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے

وہ کہتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا تھا)، جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے: وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈال رہے ہیں) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى (اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے)۔ یہ تین بار مٹی ڈالنا، اس پورے معاملہ کا کلائمکس ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

جنت کا تعارف

لارڈ میو نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ وہ ایک بار ایک جزیرے میں تھے۔ وہاں انھیں غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ منظر اتنا حسین تھا کہ میں نے چاہا کہ میں اس کو ہمیشہ دیکھتا رہوں:

I wish I could see this sunset forever

فطرت (nature) بے حد حسین ہے۔ اس کو دیکھنے سے کبھی آدمی کا جی نہیں بھرتا۔ آدمی چاہتا ہے کہ نیچر کو مستقل طور پر دیکھتا رہے۔ مگر زندگی کے تقاضے اس کو مجبور کرتے ہیں، اور اس سے سیر ہوئے بغیر وہ اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ نیچر موجودہ دنیا میں جنت کی نمائندہ ہے۔ وہ آخرت کی جنت کی ایک جھلک ہے، جنت میں جو لطافت، جو حسن، جو بے پناہ کشش ہوگی، اس کا ایک دُور کا مشاہدہ موجودہ دنیا میں نیچر کی صورت میں ہوتا ہے۔

نیچر ہم کو جنت کی یاد دلاتی ہے۔ وہ ہم کو بتاتی ہے کہ دنیا میں جنت والے عمل کرو تا کہ آخرت میں جنت کو پاسکو۔ دنیا میں آدمی جنت کی جھلک سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ مگر آخرت کی کامل دنیا میں ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ جنت سے آخری حد تک لطف اندوز ہوسکے۔

موت کا مسئلہ

19 نومبر 1994 کو دہلی کے تمام اخباروں کے صفحہ اول کی نمایاں خبر یہ تھی کہ جنرل بپن چندرا جوشی کا دہلی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ابھی صرف 59 سال تھی۔ بوقت وفات وہ آرمی چیف کے عہدہ پر تھے۔ لمبی سروس کے بعد اب وہ اپنی آخری ترقی کے دور میں پہنچے تھے اور اس وقت سینئر موسٹ سروس چیف کی حیثیت رکھتے تھے۔ 18 نومبر کو گولف کھیلنے کے بعد انھوں نے سینہ میں درد بتایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ فوری طور پر بہترین میڈیکل امداد بہم پہنچائی گئی۔ مگر وہ دوبارہ ہوش میں نہ آسکے۔ بے ہوشی کی حالت ہی میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

جنرل جوشی کے حالات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ انھیں ایکس سروس مین کا بہت خیال رہتا تھا۔ ہندستان میں ایک سولجر 35 سال کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے اور افسر 48 سال کی عمر میں۔ اس طرح ہر سال فوج سے ستر ہزار آدمی ریٹائر ہوتے ہیں۔ ان کو ان ریٹائر ہونے والوں کی بہبود کی بہت فکر رہتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ آج کا سپاہی کل کا ایکس سروس مین ہے:

Today's soldier is tomorrow's ex-serviceman.

جنرل جوشی اگر اور دور تک دیکھ سکتے تو کہتے کہ آج کا سولجر اور ایکس سروس مین دونوں ہی کل کے اعتبار سے آخرت کے باسی ہیں۔ دونوں ہی کو موت کے بعد آخرت کے ٹسٹ پر پورا اترنا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوگا کہ کون کیسا تھا۔ کون خوش بخت تھا اور کون بد بخت۔ کون کامیاب تھا اور کون ناکام۔ لوگ موت سے پہلے کی زندگی میں الجھے رہتے ہیں، حالاں کہ دانش مندی یہ ہے کہ آدمی موت کے بعد کی زندگی کے مسائل کی سب سے زیادہ فکر کرے۔ لوگ انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں، حالاں کہ حقیقت کا تقاضا ہے کہ خدا کی باتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لوگ دنیا کے قانون کی پکڑ سے بچنے کی تدبیریں کرتے ہیں حالاں کہ اس سے زیادہ انھیں اس بات کی تدبیر کرنی چاہئے کہ کہیں وہ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں۔

موت کا المیہ

موت ہر عورت اور مرد پر لازماً آتی ہے۔ موت کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ موت کے بعد دوبارہ موجودہ دنیا میں واپسی ممکن نہیں۔ موت کے بعد انسان کو ابدی طور پر ایک نئی دنیا میں رہنا ہے۔ موت کے بعد صرف بھگتنا ہے، عمل کرنا نہیں ہے۔

انسان ایک بے حد حساس (sensitive) مخلوق ہے۔ انسان کسی سختی کو برداشت نہیں کر پاتا، خواہ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ ہر عورت اور ہر مرد کو سب سے زیادہ یہ سوچنا چاہیے کہ موت کے بعد اگر اس کو سخت حالات میں رہنا پڑا تو وہ کیسے ان کو برداشت کرے گا۔ اگر انسان یہ سوچے تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو وہ کہیں گے: الحمدُ لِلّٰہِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الحزَنَ (35:34)۔ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ تکلیف (pain) کی زندگی انسان کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت زندگی ہے۔ اور تکلیف سے پاک زندگی انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ انسان اگر اس پہلو کو سوچے تو موت اس کا سب سے بڑا کنسرن بن جائے۔ وہ موت کے بارے میں اس سے زیادہ سوچے گا، جتنا وہ زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔

موت کا تصور آدمی کے لیے ماسٹر اسٹروک (master stroke) کی مانند ہے۔ ماسٹر اسٹروک کیرم بورڈ کی تمام گوٹوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا ہے۔ اسی طرح اگر آدمی کے اندر موت کا تصور زندہ ہو تو اس کے دماغ کے تمام گوشے ہل جائیں۔ اس کا سوچنا اور اس کا چاہنا، یک سر بدل جائے۔ اس کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آئے گا جو اس کو ایک نیا انسان بنا دے گا۔ موت سے غفلت آدمی کو ایک بے خبر انسان بناتی ہے۔ اس کے برعکس، موت کی یاد آدمی کو آخری حد تک ایک باخبر اور باہوش انسان بنا دیتی ہے۔

موت کا پیغام

انڈیا کے سابق پریسڈنٹ ڈاکٹر عبدالکلام 27 جولائی 2015 کو انتقال کرگیے ۔ بوقت وفات ان کی عمر 83 سال تھی۔ وہ نئی دہلی سے پرواز کرکے شیلانگ گیے ،تاکہ وہاں وہ ایک سائنسی موضوع پر لکچر دے سکیں۔ وہاں وہ اپنا لکچر دے رہے تھے کہ ان پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ اسٹیج پر گر پڑے۔ان کوفوراا سپتال لے جایا گیا۔وہاں ڈاکٹر نے اعلان کیا کہ ڈاکٹر کلام کاانتقال ہو چکا ہے۔

Former President Abdul Kalam died on July 27, while delivering a lecture at IIM Shillong. He was in Shillong to attend a course on Livable Planet Earth at Indian Institute of Management. The former President suddenly collapsed in between the lecture. He was rushed to Bethany Hospital in Shillong only to declered by doctors that he is no more.

موت ایک ایسا واقعہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر انسان پر یہ لمحہ آتا ہے کہ موت کا فرشتہ اچانک اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے انسان تم کو اس دنیا میں صرف ’’83‘‘ سال جینا تھا۔ یہ مدت پوری ہوچکی۔ اب تم کو ایک اور دنیا میں زندگی گزارنا ہے، جہاں تم ہمیشہ رہو گے۔ ’’83‘‘ سال پر تمہاری زندگی کا ایک دور ختم ہو چکا، اوراب تمہاری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

ہرانسان کو یہ معلوم ہے کہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں اس کو اپنی کامیابی کے لیے کیا کرنا ہے۔مگر یہ بات کوئی شخص نہیں جانتا کہ موت کے بعد کے دورِ حیات کے لیےاس کو کیا تیاری کرنا چاہیے جو وہاں کی ابدی زندگی میں اس کے کام آئے۔ یہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔مگر عجیب بات ہے کہ یہی وہ مسئلہ ہے جس سے ہر انسان بے خبر ہے۔ وہ دنیا کی ناکامی سے بچنے کے لیے توسب کچھ کرتا ہے،لیکن آخرت کی ناکامی سے بچنے کے لیے وہ کچھ نہیں کرتا۔کبھی بے خبری کے ساتھ،اور کبھی باخبر ہونے کے باوجود۔

موت کا واقعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اکثروا ذکر هادم اللذات. یعني الموت (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258)۔ یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس کی شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ موت دنیا کی لذتوں سے آدمی کو پوری طرح منقطع کردیتی ہے (فإنه يقطع لذات الدنيا قطعا)۔

اس حدیث میں لذات سے مراد دنیوی تمنائیں (worldly aspirations) ہیں۔ یہاں جس چیز کو ھادم اللذات کہا گیا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر موت کا زندہ شعور ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کی دنیوی وابستگی (worldly attachment) باقی نہ رہے گا۔ وہ موت سے پہلے کی زندگی کے مقابلے میں موت کے بعد کی زندگی کو زیادہ اہم سمجھے گا۔ اس کے بعد اس کی سوچ مکمل طور پر آخرت رخی سوچ (Akhiratoriented thinking) بن جائے گی۔ اس سوچ کا اثر یہ ہوگا کہ آدمی کی امنگیں، آدمی کی دوڑ بھاگ، آدمی کی منصوبہ بندی، سب آخرت رخی ہوجائے گی۔ جو آدمی موت سے غافل ہو، وہ موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے، اس کے ذہن پر موجودہ دنیا کا نقصان اور فائدہ چھایا رہتا ہے۔ وہ ایک دنیا پرست انسان بن جاتا ہے۔

لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا زندہ شعور آدمی کو حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب آجائے۔ اب وہ سب سے زیادہ اس دن کے بارے میں سوچے گا، جب کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے (المطففین: 6)۔ اب اس کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہوجائے گی کہ وہ آخرت میں اللہ کی پکڑ سے کس طرح بچ جائے۔ وہ سب سے زیادہ جہنم سے ڈرے گا، اور سب سے زیادہ جنت کا مشتاق بن جائے گا۔ اس کے لذت اور غم کے تصورات بدل جائیں گے۔ اس کے سوچنے کا طریقہ اور اس کا عملی سلوک، ہر چیز میں آخرت کا اثر دکھائی دینے لگے گا۔

موت کا تصور

ایک حدیث رسول میں موت کو ھادم اللذات (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258) کہا گیا ہے۔ یعنی کوئی انسان اگر اپنی موت کو یاد کرے تو یہ یاد اس کے لیے لذتوں کو ڈھا دینے والی بن جائے گی۔ اس کے لیے پھر کوئی لذت، لذت نہیں رہے گی۔ جن مادی چیزوں کو لے کر لوگ خوش ہوتے ہیں، وہ چیزیں اس کو خوشی نہ دے سکیں گی۔

موت کا تصور آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ تمھارے اوپر ایک ایسا دن آنے والا ہے جو اچانک تمھارا سب کچھ بدل دے گا۔ تم اپنے بنائے ہوئے گھر میں ہوگے، تم اپنے بچوں کے درمیان خوش ہوگے، تم اپنے دوستوں کے درمیان یا اپنی معاشی زندگی کے درمیان ہوگے، یا اور کسی حال میں ہوگے، اس وقت اچانک موت کا فرشتہ آئے گا۔ وہ تمھارے جسم کو چھلکے کی طرح پھینک دے گا، اور تمھارے اصل وجود کو لے کر ایک اور دنیا میں چلا جائے گا۔ تمھارے جاننے والے کچھ نہ جانیں گے کہ تم کہاں چلے گیے۔

موت کا یہ تصور آدمی کو بے حد سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ میں کیا ہوں اور میرا مستقبل کیا ہے، میری زندگی کیا ہے اور میری موت کیا ہے۔ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں مجھے کیا کرنا ہے، موت کے بعد کے دورِ حیات میں میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔

موت کی یاد آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو جائے، وہ ہر لمحہ اپنی زندگی کا محاسبہ کرنے لگے۔ موت حتمی انداز میں انسان کو بتاتی ہے کہ بظاہر اگرچہ تمھارا حال (present) تمھارے قبضے میں ہے، لیکن تمھارا مستقبل (future) ہرگز تمھارے قبضے میں نہیں۔ موت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے حال سے زیادہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو جائے۔ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات کی تعمیر کے بجائے موت کے بعد کے دورِ حیات میں مشغول ہو جائے۔

ہادم لذات

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أكثروا ذكر هادم اللذات، يعني الموت (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر موت کی حقیقت کو پوری سنجیدگی کے ساتھ یاد کرے تو اس کی زندگی کا فوکس بدل جائے گا۔ اس کی زندگی دنیا رخی زندگی نہیں رہے گی، بلکہ آخرت رخی بن جائے گی۔

جب ایک شخص دنیا پرستی کا طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ ہر وقت دنیا کمانے میں لگا رہتا ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ اس کو اپنی مصروفیت میں ایک لذت ملتی ہے۔ وہ اس مصروفیت میں اپنے لیے ایک شاندار دنیوی مستقبل کا امکان دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کو معلوم ہو کہ اس پر ایک ایسا دن آنے والا ہے، جب کہ وہ اپنی ساری کمائی چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جائے گا، تو اس کے لیے اپنی مصروفیت میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہے گی۔ اس کے اندر ایک نئی سوچ بیدار کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ وہ سوچے گا کہ اگر میری کمائی موت کے بعد میرے ساتھ جانے والی نہیں ہے تو مجھے اپنی سرگرمیوں کا رخ بدلنا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی سے غصہ ہو جائے، اور وہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ بنائے تو موت کی یاد اس کی زندگی کا رخ بدل دے گا۔ وہ سوچے گا کہ جب میرا انتقام ابدی معنوں میں کسی کا کچھ بگاڑنے والا نہیں تو میں کیوں انتقامی کارروائی میں اپنا وقت ضائع کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد آدمی کے لیے یاد دہانی (reminder) کا ذریعہ ہے۔ موت کی یاد اس کے عمل کی تصحیح کرنے والی ہے۔ موت کی یاد آدمی کو نیگیٹو کارروائی سے ہٹا کر مثبت کارروائی میں مصروف کر دیتی ہے۔ موت کی یاد آدمی کو سنجیدہ اور حقیقت پسند بناتی ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ لازمی طور پر وہ ایک دن انسان کی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں جانے والا ہے، یہ سوچ آدمی کے لیے اپنی تصحیح آپ (self correction) کا ذریعہ ہے۔

کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا

اُس کا حکم تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے
بولا نہ جائے مگر عمر کے ساٹھویں برس پہنچ کر
اس کو معلوم ہوا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔

اسپین کے ڈکٹیٹر فرینکو، کئی دن بیماری سے جنگ کرنے کے بعد آخر کار اس دنیا سے چل بسے۔ فرینکو کا عرصۂ حیات لمبا کرنے کی غرض سے اسپین میں ڈاکٹروں نے جورات دن کوشش کی اُس سے میڈیکل حلقوں میں بڑی زبردست بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا اُس وقت جب کہ قدرت کے تمام قوانین کے مطابق اُن کے حواس جواب دے چکے تھے۔ اُنہیں کچھ ہفتہ پیشتر ہی مرنے دینا چاہیے تھا؟ یا کیا ڈاکٹر اس بات میں حق بجانب تھے کہ ہر قسم کی میڈیکل امداد اُنھیں مہیا کر کے کچھ دیر تک اور جسمانی طور پر زندہ رکھنے کے لئے اُنکے درجہ حرارت کو جزوی طور پر منجمد کر دیتے۔ علاوہ بریں کیا یہ بات اخلاقی اصول کے مطابق ہے کہ قوم کے کسی لیڈر کی زندگی مصنوعی طور پر لمبی کرنا چاہیے یا کہ اُسے لمبا کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ میڈیسن کی دنیا میں ایک زبردست بحث چھڑنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ بہت سے اسکالروں نے اِس موضوع پر بحث کی ہے۔

یہ امر غیر معمولی طور پر اتفاقیہ ہے کہ اِس معاملہ پر ایک کتاب ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کی تصنیف پر 13 سال لگ گئے تھے۔ مشہور مورخ پال مرے کنیڈال نے یہ کتاب فرانس کے 11 ویں بادشاہ لوئی کے بارے میں لکھی ہے جس کو انتقال کیے ہوئے 500 برس ہو چکے ہیں۔ لوئی ایک ایسا بادشاہ تھا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے بہت کوشش کی کہ اُس کی زندگی کو طوالت دی جائے۔

فرینکو کی مانند بادشاہ لوئی ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا، جس کی مرکزی سرکار بہت مضبوط

تھی، لیکن قوم اُن کی آنکھ بند کرنے کے بعد انتشار یا خانہ جنگی کا شکار ہو سکتی تھی۔ اُسے اس بات کا بخوبی علم تھا، جیسا کہ ہمارے جدید زمانہ کے لیڈروں کو علم ہے۔ لوئی کی عمر 58 سال کی تھی جب اُس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اُسے تب اِس امر کا علم ہو گیا کہ وہ بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے گا۔ کیوں کہ اُس کے پریوار میں کوئی بادشاہ اپنا 60 واں جنم دن منا نہ سکا تھا۔

لوئی کسی محفوظ قلعے میں امن وشانتی سے رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک محل میں رہنا شروع کیا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ اس محل کی طرف جانے والی سڑکوں پر جنگلے لگا دیئے گئے تھے۔ اور محل کے چاروں طرف خندق کھودی گئی تھی۔ چالیس تیر انداز پتھروں کی دیواروں پر بیٹھے ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ انھیں حکم تھا کہ اگر کوئی اجازت کے بغیر محل کے نزدیک آنے کی جرأت کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ علاوہ بریں 400 گھوڑسوار دن رات علاقہ میں گشت کرتے رہتے تھے۔ محل کے اندر لوئی بڑی عیش پرستانہ زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کے کمرہ میں خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں۔ ماہر راگی اپنا راگ سنا کر اُسے خوش رکھتے۔ بڑے بڑے پنجروں میں بند کتّے اور پرندے جو وہاں رکھے ہوئے تھے اُسے بہت پسند تھے۔ زیادہ تر وقت وہ اپنے جسم کو اکٹھا کئے قابل رحم حالت میں آرام کرسی پر ہی گزارتا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا جسے وہ اپنے محل کی دوسری منزل سے دیکھتا رہتا۔

اگرچہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اپنی قوم کی زندگی اور موت اُس کے اختیار میں تھی۔ اس پر بھی وہ فکر مند تھا کہ اپنی رعایا پر یہ امر کیسے واضح کرے کہ وہ سب سے بڑا حکمراں ہے۔ اُس کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اختیارات کا خواہش مند کوئی امیر، منصب وار اسے ہٹا کر خود اقتدار نہ سنبھال لے اور اُسے اپنے آخری ایام ایک دیوانہ بوڑھے کی مانند گزارنے نہ پڑیں۔

اپنے بڑھاپے میں لوئی ہر ایک پر شبہ کرنے لگا تھا۔ اُسے اپنے پرانے ملازموں پر شک تھا۔ چنانچہ انھیں ہٹا کر اُن کی جگہ اُس نے غیر ملکی بھرتی کر لئے تھے۔ اور پھر اُن کو اور اُن افسروں کو بھی جو اُس کی حفاظت کے لئے مامور تھے، وہ متواتر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ وہ اُن سے یہی کہا کرتا کہ

''قدرت کو تبدیلی بہت پسند ہے''۔ سرکار کے کام کاج میں حصہ لینے کے لیے وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ شاید رعایا اس بات کو بھی بھول جائے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کے ہم عصر ایک مورخ نے اُس کی نسبت تحریر کیا ہے: ''اُس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ابھی تک حکمراں ہے ہر قسم کی چال چلی۔ وہ افسروں کو ڈسمس کر دیتا اور ان کی جگہ نئے افسر مقرر کر دیئے جاتے۔ کسی کی وہ تنخواہ کم کر دیتا تو کسی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا۔ اُس نے اپنا وقت افسروں کو مقرر کرنے اور اُن کا بھٹہ بٹھانے میں صرف کیا تھا''۔

لیکن یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ 11 واں لوئی ایک عظیم شکاری تھا۔ جانوروں سے وہ بہت انس کرتا تھا۔ اُس نے گھوڑے اور کتّے منگانے کے لیے یورپ بھر میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اور مارکیٹ کی قیمت سے بھی زیادہ دے کر اُنھیں خریدا۔ چنانچہ اٹلی، سویڈن اور جرمنی سے گھوڑے اور کتّے آنے شروع ہو گئے۔ جب وہ اُس کے محل میں پہنچ جاتے، مگر اُس کی صحت کمزوری کے سبب اس امر کی اجازت نہ دیتی کہ وہ انھیں دیکھ بھی سکے، یا جو لوگ اُن کو خرید کر لائے ہیں اُن سے بات تک بھی کر سکے۔ لیکن اُسے علم تھا کہ سارے یورپ میں اُس کی اس خریداری پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

وہ ابھی تک زندہ تھا۔

اپنی صحت بحال کرنے کا وہ اتنا آرزومند تھا کہ اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اُس کے سامنے بولا ہی نہ جائے۔ اُس کا ذاتی معالج اُس کے ایک نوکر کی مانند کام کرتا تھا۔ اور بادشاہ کا وہ پسندیدہ بن گیا تھا۔ اُسے 10,000 سنہری کراؤن ماہوار دیئے جانے لگے تھے۔ اُس وقت پورے یورپ کے کسی میدانِ جنگ میں 40 برس کام کر کے بھی ایک فوجی افسر اتنی رقم کما نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اُس کی زندگی میں ایک دن کا بھی اضافہ کر سکے تو وہ اپنا سارا خزانہ لٹانے کو تیار تھا۔ 23 جولائی 1483ء کو جب اُس کا 60 واں جنم دن نزدیک آنے والا تھا وہ اور بھی فکرمند ہو گیا۔ اُس وقت وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ مشکل سے لقمہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔

اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ہزاروں سنہری سکے جرمنی، روم اور نیپلز کے گرجا

گھروں اور مذہبی رہنماؤں میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ اُس نے تین بحری جہاز دے کر اپنے بہترین کپتان ایک جزیرہ کو بھیجے تا کہ وہاں سے بڑے بڑے کچھوے لائے جائیں۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ یہ بحری کچھوے زندگی بخش خواص کے مالک ہیں۔

اسے یاد تھا کہ فرانس کے بادشاہوں کو ان کی تاج پوشی کے وقت ایک خاص قسم کی کریم (cream) کا تلک لگایا جاتا ہے۔ یہ ایک کہاوت ہے کہ یہ کریم 496ء میں قدیم زمانہ کے ایک بادشاہ کو ایک فاختہ نے مہیا کی تھی۔ اور وہ اس کی موت سے چند ہی دن پہلے ایک سنہری رتھ میں پہنچی تھی۔ لوئی نے تمام مذہبی ذرائع کو جو ممکن تھے اِس امید کے ساتھ اکٹھا کیا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ رہ سکے۔ آخر کار نیپلز کی ایک گپھا سے ایک جوگی اس امید کے ساتھ اُس کے محل میں لایا گیا کہ اس کی پرارتھنا سپھل ہوگی۔ لیکن وہ بے اثر ثابت ہوئی۔ تاہم لوئی اُسے اپنے نزدیک رکھنے کا اتنا خواہش مند تھا کہ اُس نے اپنے وزیر خزانہ کو حکم دے دیا تھا کہ اُس جوگی کے لیے سنگترے خریدنے کے لئے خواہ سارا خزانہ کیوں نہ صرف کرنا پڑے ضرور خریدے جائیں۔

ان تمام کوششوں کے باوجود لوئی پر فالج کا حملہ ہوا، اور 30 اگست کو وہ اس دنیا سے چل پڑا۔ اُس کے منھ سے آخری لفظ یہی نکلے: میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔

فرانس کی عوام کو یہ بات بخوبی یاد ہے کہ کس طرح اپریل 1974 میں صدر جارج پومپیڈو نے جب وہ کینسر کی وجہ سے مر رہے تھے اپنے آخری بیان میں کہا تھا: میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔

اور چند روز بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ آخر کار 11 ویں لوئی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔ (ماخوذ)

ہمارا جسم ایک ایسی روح کا پنجرا ہے جس کا اصل آشیانہ صرف آخرت میں بنایا گیا ہے

اپنی نمازِ جنازہ

دہلی میں ایک مسلمان کی موت ہوئی۔ نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد ان کو ایک مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ وہ اس نماز میں شریک تھے۔ نماز شروع ہونے والی تھی تو ان کے پاس کھڑے ہوئے ایک مسلمان نے پوچھا— فرض کی نیت کروں یا سنت کی نیت کروں۔ انھوں نے کہا کہ خود اپنی نمازِ جنازہ کی نیت کرو۔ اُس آدمی کو حیرانی ہوئی۔ بعد کو انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ کسی کے مرنے پر جنازہ کی نماز پڑھنا محض ایک رسم نہیں، وہ ایک سنگین حقیقت کی یاددہانی ہے۔ اس کی یاددہانی کہ مرنے والے کی جس طرح موت ہوئی ہے، اُسی طرح میری موت بھی ہونے والی ہے۔ باجماعت نمازِ جنازہ دراصل اِسی حقیقت کی یاددہانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچی نماز جنازہ اُسی انسان کی ہے جو دوسرے کی موت میں اپنی موت کو یاد کرے۔ وہ سوچے کہ آج جو کچھ مرنے والے کے ساتھ پیش آیا ہے، وہی خود میرے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ موت کو دیکھ کر جو آدمی اس طرح سوچے، وہ جب جنازہ کی نماز کے لئے کھڑا ہوگا تو اس کا احساس یہ ہوگا کہ میں خود اپنے جنازہ کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ جو کچھ دوسرے کے ساتھ آج پیش آیا ہے، وہی میرے ساتھ کل پیش آنے والا ہے۔

موت کسی ایک انسان کا معاملہ نہیں، موت کا واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے ساتھ لازمی طور پر پیش آنے والا ہے۔ مزید یہ کہ موت کسی سے پوچھ کر نہیں آتی، موت اچانک آجاتی ہے۔ اور موت جب آجاتی ہے تو کوئی بھی انسان اس کو واپس کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، ایک انسان کے لئے بھی اور دوسرے انسان کے لیے بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنی موت کو یاد کرے، جو شخص اتنا زیادہ غافل ہو کہ دوسرے کی موت کو دیکھ کر بھی اس کو اپنی موت یاد نہ آئے، وہ گویا کہ بے حس پتھر ہے۔ وہ بظاہر انسان ہے، لیکن وہ انسانی صفات سے اُسی طرح خالی ہے جس طرح پتھر کا کوئی مجسمہ انسانی صفات سے خالی ہوتا ہے۔ موت کو یاد کرنا حساس (sensitive) انسان کی صفت ہے، اور موت کو یاد نہ کرنا بے حس (insensitive) انسان کی صفت ہے۔

موت کا تجربہ

ایک حدیث رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: أکثروا ذکر ھادم اللذات الموت (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 2992) یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ موت ہر شخص کے لیے ایک بھیانک تجربہ ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق، اپنے لئے ایک چھوٹا یا بڑا محل بناتا ہے۔ ہر آدمی اپنی تمام کوشش کرکے اپنی ایک دنیا تعمیر کرتا ہے، لیکن بہت جلد وہ وقت آتا ہے جب کہ موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ موت ہر انسان کے لیے اس کی بنائی ہوئی دنیا کی نفی (nullification) کے ہم معنی ہے۔

اگر آدمی کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ ہو تو موت کی یاد ہی اس کی اصلاح کے لیے کافی ہوجائے۔ اس کا دنیا پرستانہ ذہن ختم ہو جائے اور وہ کامل اعتبار سے، آخرت پسند انسان بن جائے۔ دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ صرف ایک ہے اور وہ ہے موت کو حذف کر کے سوچنا۔ اور تمام اچھائیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ آدمی اِس احساس کے ساتھ جئے کہ وہ ایک دن مرنے والا ہے اور اپنی زندگی کا حساب دینے کے لیے رب العالمین کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ موت سے غفلت آدمی کو غیر سنجیدہ بناتی ہے اور موت کا یقین آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔

موت کا تصور انسان سے سرکشی کا جذبہ چھین لیتا ہے۔ موت کا تصور آدمی کو یاد لاتا ہے کہ وہ صرف ایک عاجز مخلوق ہے۔ موت آدمی کو انسانِ اصلی (man cut to size) بناتی ہے۔ موت آدمی کے اندر سے بڑائی کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ موت کی یاد آدمی کو آخری حد تک متواضع (modest) بنا دیتی ہے۔ یہ صفات آدمی کے اندر ایک داخلی محرک پیدا کر دیتی ہیں جو بلاشبہ انسان کی اصلاح کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ ہے۔

موت کی یاد آدمی کو اپنی زندگی کے بارے میں آخری حد تک ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ موت کی یاد بلاشبہ انسان کے لیے سب سے بڑی مصلح کی حیثیت رکھتی ہے۔

زندگی اور موت

ایک خاتون کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ روڈ ایکسیڈینٹ میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اُن سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اِس معاملے کو آپ قرآن کی دو آیتوں کی روشنی میں دیکھئے: البقرۃ: 155 اور آل عمران: 185۔ اِس کے مطابق، موت اللہ کا ایک فیصلہ ہے۔ زندگی بھی اللہ کے فیصلے سے وجود میں آتی ہے اور موت بھی اللہ کے فیصلے سے وقوع میں آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کوئی ''حادثہ'' نہیں، موت ایک امتحان (test) ہے۔ موت کو اگر حادثہ (accident) سمجھا جائے تو اُس سے غم کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس، موت کو اگر امتحان سمجھا جائے تو آدمی کے اندر ایک نیا عزم جاگ اٹھے گا۔ وہ سمجھے گا کہ اب تک میرا امتحان زندگی کے ذریعے ہو رہا تھا، اب میرا امتحان موت کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ میری کامیابی یہ ہے کہ میں اِس معاملے کو امتحان کی نظر سے دیکھوں اور اس میں پورا اترنے کی کوشش کروں۔

کسی کی موت خواہ وہ حادثے کے طور پر ہو یا بیماری کے طور پر، وہ کبھی بے وقت نہیں آتی۔ ہر انسان جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ امتحان کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لیے امتحان کی ایک مدت مقرر ہے۔ یہ مقرر مدت پوری ہوتے ہی موت کا فرشتہ آتا ہے اور اس کی روح قبض کرکے اس کو آخرت کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ موت کے معاملے میں حقیقت پسند بنے۔ وہ موت کو ایک اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کرے۔ وہ موت کو اپنے لیے سبق کا ذریعہ بنائے، نہ کہ غم اور افسوس کا ذریعہ۔

موت کو حدیث میں ''ھادم اللذات'' (مسند احمد، حدیث نمبر 7925) کہا گیا ہے، یعنی لذتوں کو ڈھا دینے والا واقعہ۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کو موت کا حقیقی ادراک ہو جائے، وہ آخری حد تک سنجیدہ ہو جائے گا۔ وہ آج (today) کے بجائے کل (tomorrow) کو اپنا نشانہ (goal) بنا لے گا۔ اس کی زندگی مکمل طور پر آخرت رخی زندگی بن جائے گی۔

بڑائی کی نفی

معروف ہندستانی صحافی خشونت سنگھ 20 مارچ 2014 کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔ بہ وقت انتقال ان کی عمر 99 سال تھی۔ دنیوی اعتبار سے وہ ایک کامیاب انسان تھے۔ شہرت، دولت، پوزیشن، اعزاز ہر چیز انھیں حاصل تھی۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتے تھے۔ لیکن انتقال کے وقت سب کچھ اُن سے چھوٹ گیا۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی اپنی بڑائی (greatness) کا کوئی حصہ اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔

یہی ہر انسان کی کہانی ہے۔ موت اُس حقیقت کو یاد دلاتی ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ (6:94)۔ یعنی تم ہمارے پاس اکیلے آ گئے جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا، وہ سب کچھ تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

قدیم مصر کے بادشاہ فرعون نے کہا تھا: أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (79:24)۔ یعنی میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر آدمی اِس احساس میں جیتا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی بڑائی کو اپنی بڑائی سمجھتا ہے۔ موت اِس احساس کی نفی کرتی ہے۔ موت یہ بتاتی ہے کہ انسان کے پاس جو بڑائی ہے، وہ اس کے وجود کا حصہ نہیں، انسان کی ہر بڑائی ایک خارجی بڑائی ہے۔ موت اسی حقیقت کی عملی یاد دہانی ہے۔ سب سے بڑی حقیقت جو انسان کو جاننا چاہیے، وہ یہ کہ اللہ کی بڑائی اس کے اپنے وجود کا حصہ ہے، وہ کبھی اس کے وجود سے جدا ہونے والی نہیں۔ اِس کے برعکس، انسان کی بڑائی اس کے وجود کا حصہ نہیں۔ موت سے پہلے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی بڑائی خود اس کے وجود کا حصہ ہے، لیکن موت آتے ہی دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اب انسان الگ رہتا ہے اور اس کی بڑائی الگ۔ انسان دنیا سے آخرت کی طرف اِس طرح سفر کرتا ہے کہ اُس کا سب کچھ ہمیشہ کے لیے اِسی دنیا میں چھوٹ جاتا ہے۔

زندگی اور موت

گوپی ناتھ منڈے انڈیا کے مشہور لیڈر تھے۔ انڈیا کی نئی حکومت میں مرکزی وزیر کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو چکا تھا۔ 4 جون 2014 کو وہ نئی دہلی میں اپنا عہدہ سنبھالنے والے تھے، مگر اُس سے صرف ایک دن پہلے 3 جون کو نئی دہلی میں روڈ ایکسیڈنٹ کے ایک واقعے میں ان کی وفات ہوگئی۔ بوقت وفات ان کی عمر 64 سال تھی۔

یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں۔ ہر آدمی جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی پوزیشن حاصل کرلے، اُس کو بہر حال اِس دنیا میں جینے کا محدود وقت ملتا ہے۔ علامتی طور پر اس کو ''64 سال'' کہہ سکتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ کوئی بھی شخص شعوری طور پر اِس حقیقت کو نہیں جانتا۔

گوپی ناتھ منڈے کے ساتھ جس دن مذکورہ واقعہ پیش آیا، اس وقت وہ ایک وکٹری ریلی (victory rally) میں شرکت کے لیے جا رہے تھے، لیکن شرکت سے پہلے ان کی زندگی کا آخری لمحہ آ گیا۔ یہی معاملہ اِس دنیا میں ہر شخص کا ہے۔ ہر آدمی بطور خود کسی ''وکٹری ریلی'' میں شرکت کے لیے سفر کر رہا ہے، لیکن اپنی مطلوب منزل پر پہنچنے سے پہلے اس کا آخری وقت آجاتا ہے۔ وہ اپنی فتح کا جشن منائے بغیر اچانک آخرت کی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے، ایسی حالت میں جب کہ اس نے آخرت کی دنیا کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

اعداد وشمار کے مطابق، ہر دن ساری دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مر جاتے ہیں۔ ہر مرنے والا اپنے پیچھے ایک خاموش پیغام چھوڑ جاتا ہے، وہ اپنے بعد جینے والوں کو یہ خاموش پیغام دیتا ہے — اے جینے والو، موت کی تیاری کرو۔ اے دنیا کی تعمیر کرنے والو، آخرت کی تعمیر کی کوشش کرو۔ اے بے خبری میں جینے والو، اپنے آپ کو باخبر جینے والا بناؤ۔ اے دنیا میں اپنی حیثیت تلاش کرنے والو، آخرت کی جنت کے لیے اپنے آپ کو مستحق بناؤ۔ یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ جو لوگ اِس سے باخبر ہوں، وہی علم والے ہیں اور جو لوگ اس سے باخبر نہ ہوں، اُن کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔

پروموشن کی خبر

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا کہ میرا پروموشن (promotion) ہوگیا ہے، اب مجھے زیادہ تنخواہ ملے گی، زیادہ بڑا گھر رہنے کو ملے گا، اب مجھے زیادہ بڑی گاڑی استعمال کے لیے دی جائے گی۔ پہلے مجھے سفر کے لیے ریلوے کا پاس (pass) ملتا تھا، اب مجھے سفر کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملے گا، وغیرہ۔ اس کو سن کر میں نے سوچا کہ یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ جنت کے معاملے کو دنیا کی اصطلاح میں اسی طرح بیان کیا جاسکتا ہے، جنت کا معاملہ بھی گویا پروموشن کا معاملہ ہے، جن لوگوں کا ریکارڈ موجودہ غیر کامل دنیا میں اچھا ہوگا، ان کو پروموٹ کرکے آخرت کی کامل دنیا (جنت) میں داخل کردیا جائے گا۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی دنیا میں بہت زیادہ ہوش مندی کے ساتھ رہے، وہ اپنے ہر معاملے کو اِسی نظر سے جانچے کہ وہ جنّت میں داخلے کے لیے رکاوٹ ہے یا مددگار۔ اِس اعتبار سے جس آدمی کا ذہن بیدار ہو، وہ گویا کہ خود اپنا چوکی دار بن جائے گا، وہ اپنی سوچ، اپنی گفتگو، اپنا سلوک، غرض اپنے قول وعمل کی مسلسل طور پر نگرانی کرتا رہے گا، وہ حضرت عمر کے اِس قول کا مصداق بن جائے گا: وزنوا أنفسكم قبل أن توزنوا (کنز العمال: 44203) یعنی اپنے آپ کو دنیا میں تولو اِس سے پہلے کہ تم کو آخرت میں تولا جائے۔

پروموشن کی خبر کی طرح دعوت بھی ایک خبر ہے۔ اگر کسی شخص پر سچائی منکشف ہوجائے تو اس کے لیے یہ واقعہ جاب میں پروموشن کی خبر سے ٹریلین گنا زیادہ بڑا واقعہ ہوگا۔ ایسا آدمی اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی دریافت کو اپنے ذہن میں لیے رہے اور اس کا اعلان نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچائی کی دریافت اپنے آپ کسی آدمی کو داعی بنا دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے، اس کے باوجود وہ دعوت الی اللہ کا کام نہ کرے تو یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس نے سچائی کو پایا ہی نہیں۔

خودکُشی: سب سے بڑی دیوانگی

خودکشی سب سے بڑی دیوانگی ہے۔ کیوں کہ خودکشی آدمی اُس وقت کرتا ہے، جب کہ وہ زیادہ کامیاب انداز میں کوئی عمل کرنے کی پوزیشن میں ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خودکشی کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ کوئی بھی آدمی نارمل حالت میں اِس کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو خود ہی مار ڈالے۔ پھر کوئی شخص خودکشی جیسا انتہائی اقدام کیوں کرتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کو جب کوئی سخت جھٹکا لگتا ہے تو اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ فطری نظام کے تحت اُس کا دماغ محفوظ انرجی کو ریلیز (release) کر دیتا ہے۔ اِس بنا پر اُس وقت آدمی کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ اضافہ شدہ طاقت اِس لیے ہوتی ہے کہ آدمی پیش آمدہ مسئلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کر سکے، مگر وہ اِس بڑھی ہوئی طاقت کا منفی استعمال کر کے خودکشی کر لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ خودکشی کا اقدام کریں اور کسی بنا پر مرنے سے بچ جائیں، تو وہ اپنی بعد کی زندگی میں زیادہ بڑا کام کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ اقدامِ خودکشی کا واقعہ اُن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی برتر طاقت سے متعارف کر دیتا ہے۔ چناں چہ موت سے بچنے کی صورت میں وہ اس کو بھر پور طور پر استعمال کرتے ہیں اور زیادہ بڑی کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ فطرت کے اِس قانون کو شیخ سعدی نے سادہ طور پر اِس طرح بیان کیا ہے :

نہ بینی کہ چوں گُربہ عاجز شود　　　بَرآرد بہ چَنگال، چشمِ پلنگ

انسان کی اکثر غلطیاں فطرت کے قانون کو نہ جاننے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ فطرت کے قانون کے مطابق، انسان کے دماغ میں ہمیشہ محفوظ انرجی موجود رہتی ہے۔ جب کوئی سخت مسئلہ پیش آئے تو دماغ آٹومیٹک طور پر اِس محفوظ انرجی کو ریلیز کر دیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دریا میں پانی کی قلّت کے وقت بَیراج کو کھول کر مزید پانی جاری کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر فطرت کے قوانین کو سمجھے تو وہ بہت سی نادانیوں سے بچ جائے، بہت سی ناکامیوں سے وہ کبھی دوچار نہ ہو۔

خوش نما فریب

ہر زبان میں مثلیں (sayings) اور کہاوتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہاوتیں انسانی زندگی کا تجربہ ہوتی ہیں۔ ہر مثل لمبے انسانی تجربے کے بعد بنتی ہے۔ اِسی قسم کی ایک انگریزی مثل یہ ہے — یہ اتنا زیادہ اچھا ہے کہ وہ سچ نہیں ہوسکتا:

It is too good to be true.

یہ ایک حقیقت ہے کہ سچ کے مقابلے میں، جھوٹ ہمیشہ خوش نما ہوتا ہے۔ حقیقی نفع کے مقابلے میں، فرضی نفع ہمیشہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ مخلصانہ بات کے مقابلے میں، منافقانہ بات ہمیشہ خوب صورت ہوتی ہے۔ نصیحت کے مقابلے میں، خوش کرنے والی بات سننے میں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقی تاریخ کے مقابلے میں، فرضی قصہ کہانیاں زیادہ دل چسپ ہوتی ہیں۔ حقیقت پسندانہ کلام کے مقابلے میں، رومانوی کلام ہمیشہ زیادہ دل کش نظر آتا ہے۔ کار آمد بات کے مقابلے میں، بے فائدہ بات آدمی کو زیادہ پرکشش معلوم ہوتی ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ ایسی حالت میں آدمی ہر وقت امتحان کی حالت میں ہے۔ ہر وقت اس کو چوکنا بن کر رہنا ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ جھوٹ کے فریب میں پھنس کر سچائی سے دور ہوجائے۔ وہ ہوائی باتوں سے مسحور ہو کر، حقیقت پسندی کے راستے سے ہٹ جائے۔ وہ منافقانہ باتوں کے فریب میں آکر، مخلصانہ بات کو قبول نہ کرسکے۔

اِس دنیا میں ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ آدمی سونے کے ملمّع کو سونا سمجھ کر لے لے اور پھر وہ سخت نقصان میں پھنس جائے۔ وہ جھوٹے الفاظ کے فریب میں آکر ایسی چھلانگ لگا دے، جو اس کو ایسے گڑھے میں گرا دے، جس سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے لیے نہ ہو۔

اِس دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خوش نما باتوں سے متاثر نہ ہو، وہ ٹھوس حقائق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ دانش مند صرف وہ شخص ہے جو اِس معیار پر پورا اترے۔

موت: ایک خدائی منصوبہ

قرآن کی تین سورتوں میں یہ آیت آئی ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ المَوْتِ (3:185)۔ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے:

Every human being is bound to taste death

قرآن کا یہ بیان پوری انسانی تاریخ میں ایک واقعہ ثابت ہوا ہے۔ دولت، طاقت، سیاسی اقتدار، کوئی بھی چیز انسان کو موت سے بچانے والی نہ بن سکی۔ ہر پیدا ہونے والا انسان ایک مقرر مدت کے بعد لازمی طور پر مر جاتا ہے۔ موت سے بچنا کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہ ہوسکا۔

اگر ایسا ہوتا کہ انسان اتفاقاً پیدا ہو اور اتفاقاً مر جائے تو کچھ لوگ مرتے، اور کچھ لوگ لمبی مدت تک زندہ رہتے۔ لیکن موت کے معاملے میں کسی فرد کا استثنا نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ موت کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں، بلکہ وہ فطرت کی منصوبہ بندی (planning) کا معاملہ ہے۔ یہ خالق کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے، وہ بے سبب ہونے والا کوئی واقعہ نہیں۔

موت کا ایک خدائی منصوبہ ہونا، مزید یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی اور موت ایک بامقصد ظاہرہ ہے۔ اور جب یہ مان لیا جائے کہ زندگی اور موت کے پیچھے ایک تخلیقی مقصد ہے تو اس کے بعد لازم ہوجاتا ہے کہ انسان اس مقصد کو دریافت کرے، اور اس کے مطابق اپنی تشکیل کرے۔ اسی میں انسان کی کامیابی چھپی ہوئی ہے۔ موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا کی تعمیر انسان کا نشانہ نہیں ہوسکتا۔ انسان کا نشانہ صرف وہ چیز ہوسکتی ہے جس میں زندگی اور موت دونوں کی توجیہہ موجود ہو، جس میں زندگی بھی بامعنی نظر آئے اور موت بھی بامعنی۔

پیغمبرِ اسلام نے فرمایا: أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ، يَعْنِي المَوْت (ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258)۔ یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، جو کہ لذات کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لذاتِ حیات کی بنیاد پر اپنا منصوبہ نہ بناؤ، بلکہ حقائقِ موت کی بنیاد پر اپنا منصوبہ بناؤ۔

موت کا ظاہرہ

موت کا ظاہرہ (phenomenon) ایک انتہائی انوکھا ظاہرہ ہے۔ ہر انسان جو اس زمین پر پیدا ہوتا ہے، وہ ضرور ایک دن مر جاتا ہے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی تندرست ہو، اس کے پاس کتنے ہی زیادہ اسباب کی کثرت ہو۔ تاریخ میں ایسے انسان پیدا ہوئے، جو اپنے آپ کو موت سے بچانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی کوشش مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ ساری کوشش کے باوجود وہ ایک دن اسی طرح مر گیے، جس طرح اس دنیا میں دوسرے انسان مر رہے ہیں۔

یہ واقعہ قرآن کی صداقت کا ایک قطعی ثبوت ہے۔ قرآن میں موت کے بارے میں تین بار یہ الفاظ آئے ہیں: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الموْتِ (3:185, 21:35, 29:57)۔ یعنی ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے یہ اعلان کیا کہ اس زمین پر پیدا ہونے والے ہر مرد اور ہر عورت کو ضرور ایک دن مرنا ہے۔ اس میں کسی بھی فرد کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔ خواہ وہ بادشاہ ہو یا دولت مند یا کوئی بہت بڑا ڈاکٹر۔

یہ پوری انسانی تاریخ کے بارے میں ایک عمومی ریمارک ہے۔ وہ پوری تاریخ انسانی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تاریخ کے بارے میں قرآن کا یہ ریمارک پوری تاریخ کا ایک عمومی واقعہ بن گیا۔ موت کے بارے میں اس قسم کا بیان کسی بھی کتاب میں موجود نہیں، نہ مذہبی کتاب میں اور نہ غیر مذہبی کتاب میں۔ جو بھی مرد یا عورت اس زمین پر پیدا ہوئے، وہ مقرر مدت کے اندر مر کر اس دنیا سے چلے گیے۔

ایسا ایک عمومی بیان جو عملاً پوری تاریخ کا ایک ثابت شدہ واقعہ بن جائے، یہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس قول کا قائل اللہ رب العالمین ہے، وہ ہستی جس کے ہاتھ میں انسان کی موت بھی ہے اور زندگی بھی۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اپنے آپ ثابت ہوتی ہے کہ قرآن اللہ رب العالمین کی کتاب ہے۔ یہ واقعہ خدا کے وجود کا ثبوت بھی ہے، اور قرآن کی صداقت کا ثبوت بھی۔

موت کا مثبت تصور

وسیع خلا میں ان گنت ستارے اور سیارے مسلسل گھوم رہے ہیں، لیکن ان کی رفتار اتنی کامل صحت کے ساتھ قائم ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود کبھی ان میں ادنی فرق بھی نہیں ہوتا۔ ہر روز کے اخبار میں منٹ اور سکنڈ کے تعین کے ساتھ یہ چھپتا ہے کہ آج کی صبح سورج کے طلوع کا وقت کیا ہے اور شام کو اس کے غروب کا ٹھیک وقت کیا۔ یہی حال تمام ستاروں اور سیاروں کا ہے۔ گویا کہ کائنات میں تنظیم اوقات (time management) معیار صحت کی آخری حد پر ہے۔ جب کہ انسانی زندگی میں ایسا نہیں۔

کائنات کی اصل ایٹم ہے۔ مادّی کائنات پوری کی پوری ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ ایٹم کی بے شمار صورتوں کی ترتیب سے کائنات کی تمام چیزیں بنی ہوئی ہیں، اور جیسا کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز آخری حد تک مکمل ہے۔ مثلاً گھاس اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ شمسی نظام اپنے فائنل ماڈل پر ہے، اسی طرح تمام چیزیں۔ گویا کہ کائنات سورس مینج منٹ (source management) کا آخری کامل نمونہ ہے۔ جب کہ انسان کو اپنی زندگی میں یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

اِسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کے اندر بے شمار سرگرمیاں ہر لمحہ جاری رہتی ہیں، لیکن یہ تمام سرگرمیاں پوری طرح نتیجہ خیز (result-oriented) صورت میں ہوتی ہیں۔ وسیع دنیا میں کوئی بھی سرگرمی بے نتیجہ نہیں۔ حتی کہ کیڑے مکوڑے جو رات دن سرگرم عمل رہتے ہیں، وہ بھی انتہائی مفید کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔ جب کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کی کامل درجے میں سرگرمیاں موجود نہیں۔

اسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں کی کوئی بھی چیز جمود کی حالت میں نہیں۔ ہر چیز مسلسل طور پر متحرک ہے۔ ایٹم کے اندر برقی ذرات کی غیر مرئی گردش سے لے کر وسیع خلا میں

ستاروں کی مسلسل گردش تک ہر چیز حالتِ حرکت میں ہے۔اس کے باوجود کائنات کے کسی بھی حصے میں ٹکراؤ کا حادیث پیش نہیں آتا۔ گویا کہ ہماری دنیا میں عالمی سطح پر بے مسئلہ کلچر (no problem culture) قائم ہے جب کہ انسان کو اس قسم کی زندگی حاصل نہیں۔

اِسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں کی تمام چیزیں نفع بخشی کے اصول پر اپنا کام کرتی ہیں۔سورج سے نکلنے والی شعاعوں سے لے کر درختوں سے نکلنے والی آکسیجن تک تمام چیزیں دوسروں کے لیے یک طرفہ طور پر نفع بخش بنی ہوئی ہیں۔اس مقصد کے لیے وہ کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیتی ہیں۔گویا کہ موجودہ دنیا میں ہر طرف لینے کے بجائے دینے کا کلچر (giver culture) رائج ہے،مگر انسان کی دنیا میں اس قسم کا کلچر موجود نہیں۔

ایک فلسفی کا قول ہے — موجودہ دنیا میں ہر چیز حسین ہے، یہ صرف انسان ہے جو کہ حسین نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ ہر عورت اور مرد کو ہوتا ہے۔سورج جب صبح کو طلوع ہوتا ہے اور شام کو جب وہ غروب ہوتا ہے تو وہ کسی آنکھ والے کے لیے ایک انتہائی حسین مشاہدہ ہوتا ہے۔سرسبز درخت کو دیکھ کر آنکھ کو بے پناہ تازگی ملتی ہے۔ بہتے ہوئے دریا کے کنارے آپ کھڑے ہوں تو وہاں آپ کو ایک اَتھاہ سُرور کا تجربہ ہوتا ہے۔ پھول اور پھل، دریا اور پہاڑ حتی کہ گھاس تک میں بھی آدمی کے لیے حسنِ مشاہدہ کی ایک کائنات نظر آتی ہے۔مگر انسان کو خود اپنی زندگی میں یہی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے معیار پسند (idealist) واقع ہوا ہے۔اس کے اندر بے پناہ حد تک یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی معیاری دنیا پائے اور اس کے اندر ہمیشگی کی زندگی بسر کرے،مگر آدمی اپنی اِس مطلوب دنیا کو نہیں پاتا اور محدود عمر گزار کر ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں کی ہر چیز اُس کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ یہاں معیاری دنیا کو پانا پوری طرح ممکن ہے۔

فلسفیوں کے نزدیک موت کے دو تصور ہیں۔ ایک ہے منفی تصورِ موت (negative concept of death) اور دوسرا ہے مثبت تصورِ موت (positive concept of death)۔

سائنس کا اصول ہے کہ جو تصور حقائق سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو، اس کو بطور واقعہ قبول کرلیا جائے گا اور جو تصور حقائق سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ تصور غیر واقعی سمجھ کر رد کر دیا جائے گا اِس پہلو سے دیکھئے تو منفی تصورِ موت قابلِ رد قرار پاتا ہے اور مثبت تصور موت قابلِ قبول ٹھہرتا ہے۔

کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز اپنے امکان (potential) کو واقعہ (actual) بنا رہی ہے۔ مثلاً درخت کا بیج اپنے امکان کو آخری حد تک واقعہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایٹم اپنے امکان کو آخری کامل حد تک واقعہ بنائے ہوئے، وغیرہ۔ یہ صرف انسان ہے جو اتھاہ امکان لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے امکانات کو تکمیل تک پہنچائے بغیر مر کر دفن ہوجاتا ہے۔ انسان کے مائنڈ میں سوملین، نلین، نلین پارٹکل ہیں۔ انسان کا مائنڈ اتھاہ امکانات کا خزانہ ہے، لیکن انسان اس امکان کو بمشکل چند فیصد استعمال کرتا ہے اور پھر موت اس کی زندگی کا خاتمہ کردیتی ہے۔

موت کا مثبت تصور ہی موت کا حقیقی تصور ہے۔ کیوں کہ تمام متعلق حقائق (relvant data) اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ موت کے مثبت تصور کا مطلب یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ موت ابدی زندگی میں داخلے کا دروازہ ہے۔ موت کے بعد آدمی اُس طویل تر مرحلۂ حیات میں داخل ہوجاتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پا سکے۔ جہاں اس کو یہ موقع ہو کہ وہ اپنی ہستی کے اتھاہ امکانات کو بروئے کار لاسکے۔

موت کے مثبت تصور کا پیغام یہ ہے کہ موت سے پہلے کے مختصر مرحلۂ حیات میں اپنے اندر اُس ربانی شخصیت کی تعمیر کرو جو موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں تم کو تمھاری آرزوؤں کے مطابق، ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی دنیا میں جینے کا مستحق بنائے۔

لوگ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندگی کا کامیاب سفر طے کر رہے ہیں

موت کی طرف سفر

ایک صاحب دہلی کے علاقہ یمنا وہار میں 45 سال سے رہتے تھے۔ وہ ایک دینی مدرسہ میں انگلش کے ٹیچر تھے۔ 18 فروری 2009 کی صبح کو وہ حسب معمول اپنے گھر سے مدرسے کے لیے روانہ ہوئے۔ اُس وقت ان کی صحت بظاہر بالکل ٹھیک تھی۔ ابھی وہ مدرسے میں تھے کہ دوپہر کے وقت اُنھیں سانس کی تکلیف محسوس ہوئی۔ تکلیف بڑھی تو مدرسے کے طلبا اُن کو رکشے پر بٹھا کر اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں اُن پر بے ہوشی جیسی حالت طاری ہوگئی۔ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بوقت وفات ان کی عمر تقریباً 75 سال تھی۔

یہ صرف ایک شخص کا واقعہ نہیں، یہی ہر عورت اور ہر مرد کا واقعہ ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی سفر میں ہے۔ اس کے ذہن میں ایک منزل ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مطلوب منزل کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر ہر ایک کے لیے مقدر ہے کہ وہ اِس دنیا میں صرف ''75 سال'' رہے، اور اس کے بعد اُس کو اُس دوسری دنیا میں پہنچا دیا جائے جہاں سے دوبارہ وہ لوٹنے والا نہیں۔ ہر سفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے موت کا سفر ہے، خواہ بظاہر وہ دیکھنے والوں کو کوئی اور سفر دکھائی دیتا ہو۔

یہی اِس دنیا میں آنے والے ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر زندہ انسان پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ اس کی سانس بند ہو جائے، جب اُس کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، جب وہ سوچنے کے قابل نہ رہے، جب کہ اس کی آنکھ اور اس کے کان اپنا کام کرنا بند کر دیں، جب کہ وہ اپنا تمام اثاثہ چھوڑ کر بالکل تنہا اگلے دورِ حیات میں داخل ہو جائے۔

یہی وہ سنگین حقیقت ہے جس کو ہر عورت اور ہر مرد کو سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ یہی وہ انجام ہے جس کی ہر ایک کو سب سے زیادہ تیاری کرنا چاہیے۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کے بارے میں ہر ایک کو سب سے زیادہ سنجیدہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ اِس سوچ کے ساتھ زندگی گزاریں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخر کار کامیاب ہوں گے۔

موت کا ذکر کثیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اکثر و اذکر ھادم اللذات، یعني الموت (ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کی یاد آدمی کے اندر دنیا رخی سوچ کو منہدم کردیتی ہے اور اُس کے اندر آخرت رخی سوچ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر آدمی بار بار موت کو یاد کرے، تو اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا پسند انسان کے بجائے آخرت پسند انسان بن جائے گا۔

اِس حدیث میں لذت کا لفظ اُن تمام چیزوں کے لیے ہے جو آدمی کے لیے کسی چیز کو مرکز توجہ بناتی ہے۔ اِس لحاظ سے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اِس حقیقت کو بہت زیادہ یاد کرے کہ وہ اِس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ سو سال سے بھی کم مدت میں مر جائے گا تو اُس کا مرکزتوجہ بدل جائے گا۔ وہ اُس دنیا کو زیادہ سے زیادہ اہم سمجھے گا جو موت کے بعد آنے والی ہے، نہ کہ اُس دنیا کو جس میں موت سے پہلے عارضی طور پر زندگی گزار رہا ہے۔

یہ طرزِ فکر آدمی کے اندر ایک انقلاب پیدا کردے گا۔ اُس کی سوچ بدل جائے گی، اُس کا سلوک بدل جائے گا، اُس کے لین دین کا طریقہ بدل جائے گا، اُس کی اخلاقی روش بدل جائے گی، اُس کے روز وشب بدل جائیں گے۔ یہی مطلب ہے لذتوں کو ڈھانے کا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد آدمی کے اندازِ فکر کو پوری طرح بدل دیتی ہے۔ جس چیز کو آج کل ''یہیں اور ابھی'' (right here, right now) کہا جاتا ہے، وہ صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انسان موت سے غافل ہو۔ اگر اُس کو موت کی حقیقت کا زندہ شعور ہوجائے تو وہ کبھی اِس قسم کا فارمولا نہ اپنائے۔ موت کے ھادم اللذات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ موت آدمی کی زندگی کے رخ کو مکمل طور پر بدل دیتی ہے۔

ایک رِمائنڈر

موت مرنے والے کے لیے موت ہے، اور زندہ رہنے والے کے لیے اپنی موت کا رمائنڈر (reminder)۔ جب کوئی شخص مرتا ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بولنے والا چپ ہو گیا، لیکن اُس کا چُپ ہونا اپنے آپ میں ایک اعلان ہوتا ہے۔ یہ اعلان کہ — آنے والا وقت میرے اوپر آچکا، اب یہی وقت تمھارے اوپر آنے والا ہے۔ تم آنے والے وقت کے لیے تیار رہو جاؤ۔

رواج ہے کہ جب کسی شخص کی عمر کا ایک سال پورا ہوتا ہے اور اس کی عمر کا اگلا سال شروع ہوتا ہے تو اُس وقت اس کی سال گرہ (birthday) منائی جاتی ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس کو موت کی یاد کا دن سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کی عمر کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن (count down) ہو رہا ہے۔ ہر سال گرہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تمھاری مدتِ حیات کا ایک اور سال کم ہو گیا۔ موت اِسی کاؤنٹ ڈاؤن کی تکمیل ہے۔

لوگ اپنے یومِ پیدائش کو happy birthday کے طور پر مناتے ہیں، لیکن حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے دیکھیے تو معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ ہر نئی سال گرہ دراصل اِس بات کی یاد دہانی ہے کہ موت یا یوم الحساب کا وقت اور زیادہ قریب آچکا، آخرت کی تیاری کا ایک اور سال کم ہو گیا۔

موت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا سے چلا گیا۔ موت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنی تمناؤں کی تکمیل کے بغیر مرجائے۔ یہ اِس بات کا اشارہ ہے کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے تمناؤں کی تکمیل کی دنیا نہ تھی۔ تمناؤں کی تکمیل کی دنیا صرف اگلی دنیا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اِس اشارے کو سمجھے اور موجودہ دنیا کی زندگی کو تیاری کا مرحلہ سمجھ کر اپنے آپ کو اگلی دنیا کے قابل بنائے۔ زندگی عمل کا وقفہ ہے اور موت خدا کی عدالت میں پیشی کا وقت۔ یہ ہر انسان کے لیے بے حد سنگین معاملہ ہے۔ دانش مند وہ ہے جو اِس معاملے کو سمجھے اور اس کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنائے۔

ایک خط

برادر محترم　　　　　　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل شام کو ایک صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ جنوبی کوریا سے ۱۷ اگست کو آتے ہوئے میں ممبئی کے راستہ سے واپس ہوسکتا تھا۔ اس طرح مجھے آپ کی والدہ محترمہ کی آخری رسوم میں شریک ہونے کی سعادت مل جاتی۔ مگر شاید ایسا ہونا مقدر نہ تھا۔

اسلام کی ایک عجیب تعلیم دعا ہے۔ دعا کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ کسی کے ساتھ اگر عملی اعتبار سے کوتاہی ہوجائے تو انسان کو چاہئے کہ وہ اُس کے حق میں نیک دعائیں کرے۔ میں دعا کے ساتھ آپ کے جذبات میں شریک ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اُن کے ساتھ ہمارے لیے بھی جنت میں داخلہ کی صورت پیدا فرمائے۔

ماں بلاشبہ ہر مرد وعورت کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر غالباً ماں کی سب سے زیادہ انوکھی اور امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے رحمتِ خداوندی کا ایک عملی تعارف ہے۔ خدا تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہے۔ عام حالات میں یہ ایک نظری عقیدہ ہے مگر ماں کی صورت میں خدا نے اپنی اس صفت کو پیشگی طور پر دکھا دیا ہے۔ ماں کی شفقت اور محبت میں ہر بندۂ خدا کے لیے اس امید کا سامان موجود ہے کہ اُس کا خدا اُس کے ساتھ یک طرفہ طور پر رحمت کا معاملہ فرمائے گا، جیسا کہ ماں ہر حال میں اپنی اولاد کے ساتھ یک طرفہ طور پر رحمت کا معاملہ کرتی ہے۔

ماں کی وفات عام طور پر اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کی اولاد ابھی دنیا میں زندہ رہتی ہے۔ ماں کی وفات کا یہ پہلو اپنے اندر ایک اور اہم نصیحت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ ماں دنیا سے رخصت ہو کر اپنے پس ماندگان کو بتاتی ہے کہ اسی طرح تمہیں بھی رخصت ہونا ہے۔ ماں اپنی عمر پوری کر کے یہ پیغام دیتی ہے کہ اے زندہ رہنے والو، یاد رکھو کہ تمہارا ابھی کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ اس طرح تمھیں بھی

ایک دن اپنی موت سے دوچار ہونا ہے۔

یہ یاددہانی کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ سوتے ہوئے انسان کو جگانے کے ہم معنیٰ ہے۔ یہ غیر متحرک لوگوں کو حرکت میں لانے کا ذریعہ ہے۔ یہ اس بات کی یاددہانی ہے کہ اے لوگو، اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ بھر پور طور پر استعمال کرو، اس سے پہلے کہ اپنے وقت کو استعمال کرنے کا موقع ہی ختم ہو جائے۔

قرآن کے مطابق، موت ہر پیدا ہونے والے کے لیے مقدر ہے۔ موت بلاشبہہ ہر انسان کے لیے سب سے بڑا حادثہ ہے۔ مگر خدا نے حیرت انگیز طور پر اس کو ہمارے لیے رحمت کا سبب بنا دیا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب موت کا تجربہ پیش آئے تو پسماندگان کو چاہئے کہ وہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ صبر کرنے والوں کے لیے عظیم انعام کی بشارت ہے۔

اس طرح کے معاملہ میں صبر کرنا کیوں خدائی انعام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ صبر دراصل خدا کے فیصلہ پر راضی ہونے کے ہم معنیٰ ہے۔ بلاشبہہ کسی بندہ کے لیے یہ سب سے بڑی سعادت ہے کہ خدا اُس کے لیے ایک ناپسندیدہ چیز کا فیصلہ کرے اور وہ اُس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر اُس پر دل سے راضی ہو جائے۔ اس قسم کی موت اپنے پسماندگان کے لیے اسی عظیم خدائی انعام کا ذریعہ ہے۔

یہ بھی خدا کی ایک عجیب رحمت ہے کہ جانے والا تو چلا گیا۔ اُس کو اپنے مقرر وقت پر جانا ہی تھا۔ مگر اس واقعہ میں خدا نے اپنی رحمت سے یہ ناقابلِ بیان حد تک قیمتی پہلو رکھ دیا کہ پسماندگان اگر اُس کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اُس پر راضی ہو جائیں تو خدا اُن کی اس رضامندی کی اس طرح قدردانی کرے گا کہ جو چیز اُنھوں نے کھوئی ہے وہ مزید اضافہ کے ساتھ اُنھیں واپس مل جائے۔

موت کا واقعہ بظاہر ایک حادثہ ہے مگر اس دنیا میں ہر مائنس کے ساتھ پلس موجود ہوتا ہے۔ اور بلاشبہہ موت کا واقعہ اس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

نئی دہلی 23 اگست 2003 دعا گو وحیدالدین

اچانک موت

انڈیا کے سابق پریسڈنٹ ڈاکٹر عبدالکلام 27 جولائی 2015 کو انتقال کرگیے۔ بوقت وفات ان کی عمر 83 سال تھی۔ وہ نئی دہلی سے شیلانگ گیے۔ وہاں ان کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف منیجمنٹ (Indian Institute of Management) شیلانگ میں ایک سائنسی موضوع پر لکچر دینا تھا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے اپنا لکچر شروع کیا۔ اس وقت ہال میں سامعین اور میڈیا کے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

ڈاکٹر کلام بمشکل پانچ منٹ بول پائے تھے۔ اس کے بعد اچانک ان کی زبان بند ہوگئی، اور وہ اسٹیج پر گر پڑے۔ ان کو فوراً اسپتال لے جایا گیا، لیکن وہاں ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ ڈاکٹر کلام کی موت واقع ہوچکی ہے۔ لکچر کا آخری جملہ جو ان کی زبان سے نکلا، وہ یہ تھا:

It is the destiny of our nation that an Indian brain requires an acknowledgment from a foreign...

موت لازماً ہر انسان پر آتی ہے۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ موت کسی آدمی پر اس طرح آتی ہے کہ وہ بیمار ہوجائے، یا اس کو کوئی حادثہ پیش آجائے، یا وہ بوڑھا ہو کر مرے۔ لیکن خالق کبھی ایسا کرتا ہے کہ انسان کی موت اچانک آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نہ کوئی آخری وصیت کرسکتا، اور نہ وہ اپنا درد دوسروں سے بیان کرسکتا۔ وہ بالکل نارمل حالت میں ہوتا ہے کہ اچانک اس کی آواز بند ہوجاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔

کسی شخص پر اچانک موت اس لیے آتی ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر سبق لیں، وہ بے خبری کی زندگی نہ گزاریں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک صحابی رسول عبد اللہ ابن عمر نے ان الفاظ میں بیان کیا: إذا أمسيت فلا تنتظر الصباح، وإذا أصبحت فلا تنتظر المساء (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6416) جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب تم صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔

یاد دہانی کی موت

ایک صاحب گڈ ورڈ بکس اور مکتبہ الرسالہ کے ممبر تھے۔ 16 مارچ 2008 کو دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر تقریباً 50 سال تھی۔ اُس وقت وہ تندرستی کی حالت میں تھے۔ بہ ظاہر موت کے کوئی آثار نہ تھے، مگر 16 مارچ کو ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا اور اُس میں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔

موت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک، متوقّع موت(expected death)اور دوسری، غیر متوقع موت(unexpected death)۔ متوقع موت وہ ہے، جب کہ انسان بوڑھا ہو گیا ہو، وہ بیمار ہو کر بستر پر پڑ جائے اور لوگ پیشگی طور پر یہ سمجھ لیں کہ اب اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ایسی موت کو لوگ ایک ہونے والا واقعہ سمجھتے ہیں، وہ اُس سے اپنے لیے کوئی سبق نہیں لیتے۔

دوسری موت وہ ہے جو غیر متوقع ہو۔ اِس طرح کی موت میں ایسا ہوتا ہے کہ مرنے والا ابھی جوانی کی عمر میں ہوتا ہے۔ وہ تندرست حالت میں اپنا کام کر رہا ہوتا ہے اور پھر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ ایسی موت کو عام طور پر بے وقت کی موت (untimely death) کہا جاتا ہے۔ مگر ایسی موت بے وقت کی موت نہیں ہوتی۔ زیادہ صحیح طور پر وہ یاد دہانی کی موت(reminder death) ہوتی ہے۔ وہ ایک چشم کُشا موت ہوتی ہے، تا کہ لوگ موت کو یاد کرکے اپنی اصلاح کر لیں۔

جو واقعہ معمول کے طور پر پیش آئے، اُس کے بارے میں لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ مگر جو واقعہ غیر معمولی طور پر یا خلافِ توقع پیش آئے، وہ لوگوں کے لیے ایک دھماکہ خیز واقعہ بن جاتا ہے۔ ایسا واقعہ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مذکورہ قسم کی موت ایسا ہی ایک دھماکہ خیز واقعہ ہے۔ وہ لوگوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ ایسا ایک واقعہ گویا کہ بیداری کا ایک الارم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سونے والو جاگو، کیوں کہ اب غفلت کا وقت ختم ہو چکا— عام موت ایک خاموش سبق ہے، اور مذکورہ قسم کی موت ایک بولتا ہوا سبق۔

آخرت کا ائر پورٹ

ایک بار میں ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے ایک ائر پورٹ پر اترا۔ میں اور دوسرے اکثر مسافر ضروری مراحل سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے، لیکن چند مسافر ایسے تھے جن کو ائر پورٹ پر روک لیا گیا۔ اُن سے کہا گیا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریے، آپ لوگوں کی خصوصی چیکنگ ہوگی۔ ان افراد کے بارے میں کوئی خفیہ اطلاع ملی تھی، جس کی وجہ سے ائر پورٹ کے عملہ نے اُن کے ساتھ ایسا کیا۔ ائر پورٹ پر یہ منظر دیکھ کر مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آئی۔ وہ آیت یہ تھی: وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ (37:24)۔ یعنی ان لوگوں کو ٹھہراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

غور کیجئے تو زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ انسان جس زمین پر آباد ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ گویا کہ ہم ایک ایسے ہوائی جہاز پر سوار ہیں جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک ائر پورٹ کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ ائر پورٹ آخرت کا ائر پورٹ ہے۔ ایک وقت آئے گا، جب کہ تمام انسان آخرت کے ائر پورٹ پر اتار دئے جائیں گے۔ یہاں یہ واقعہ ہوگا کہ کچھ لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم یہاں ٹھہرو، تم سے ابھی پوچھ گچھ ہونے والی ہے۔ دوسری طرف، کچھ ایسے خوش نصیب لوگ ہوں گے جن کا استقبال فرشتے یہ کہہ کر کریں گے : سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ (39:73)۔ یہ صورتِ حال سارے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والی ہے۔ دنیا کے سفروں کا وقت مقرر رہتا ہے، لیکن آخرت کے اس سفر کا وقت مقرر نہیں۔ کسی بھی لمحہ انسان کے اوپر وہ وقت آسکتا ہے، جب کہ زندگی کا جہاز آخرت کے ائر پورٹ پر اتر جائے اور پھر وہاں کچھ لوگ پوچھ گچھ کے لیے روک لئے جائیں اور کچھ لوگوں کو فرشتے خوش آمدید کہتے ہوئے جنت میں داخل کر دیں۔ بلاشبہ یہی وہ سب سے بڑی بات ہے جس پر ہر عورت اور مرد کو سوچنا چاہئے، اور جس کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ آنے والا وقت اعلان کے بغیر کسی بھی وقت آ جائے گا اور پھر کسی کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ لوٹ کر دوبارہ پیچھے کی طرف جا سکے۔

موت کاالارم

اکتوبر 2011 میں کئی مشہور افراد کی موت ہوئی۔ مثلاً کینیڈا کا سائنس داں رالف اسٹین مین (Ralph Steinman) 3 اکتوبر 2011 کو ان کا انتقال ہوا، جب کہ ان کی عمر 68 سال تھی۔ اُن کو میڈیسن پر نوبل پرائز ملنے والا تھا۔ نوبل پرائز کے اعلان سے صرف تین دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا:

He died just three days before he could be told of his award.

اِسی طرح امریکا کے کمپیوٹر ایکسپرٹ اسٹیو جابس (Steve Jobs) کی وفات 6 اکتوبر 2011 کو ہوئی، جب کہ ان کی عمر 56 سال تھی۔ وہ امریکی کمپنی ایپل (Apple) کے سابق چیف ایگزیکٹیو اور اس کے شریک بانی تھے۔ انھوں نے آئی فون (iPhone) اور آئی پوڈ (iPod) سے دنیا کو متعارف کرایا۔ ان کی موت ایپل کی طرف سے آئی فون کا نیا ماڈل 4-S جاری کئے جانے کے صرف ایک ماہ بعد ہوئی۔ اِسی طرح انڈیا کے مشہور سنگر (singer) جگ جیت سنگھ جن کو کنگ آف غزل کہا جاتا تھا، اپنے کیریر کے عین عروج کے زمانے میں 10 اکتوبر 2011 کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ بوقتِ وفات ان کی عمر 70 سال تھی۔ ایک حادثے میں اپنے بیٹے کی موت کے بعد انھوں نے یہ شعر گایا تھا جو اُن کی موت کے بعد خود اُن پر صادق آ گیا:

چٹھی نہ کوئی سندیش، جانے وہ کون سا دیش، جہاں تم چلے گئے!

موت کا یہ واقعہ جو ہر دن کسی نہ کسی عورت یا مرد کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ ہر ایک کے لیے ایک الارم ہے۔ موت یہ بتاتی ہے کہ اِس دنیا میں انسان کے لیے صرف محدود مدت تک رہنا مقدر ہے، اِس کے بعد وہ اپنے خالق کے پاس چلا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنے ابدی انجام کا فیصلہ سنے۔ ہر انسان کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی زندگی اور موت کے بارے میں اپنے خالق کے تخلیقی منصوبہ کو جانے، وہ خالق کی منشا کے مطابق، اِس دنیا میں اپنی زندگی گزارے، تاکہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں وہ اپنے خالق کا انعام پا سکے، یعنی ابدی جنت کا انعام۔

ابدی صحرا

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا میں ایک سبق آموز واقعہ نظر سے گزرا۔ ممبئی کے ایک ایکٹر آنند سوریاونشی (Anand Suryavanshi) نے اپنی بڑی موٹر کار گورے گاؤں (بمبئی) میں پے اینڈ پارک ایریا (pay-and park area) میں کھڑی کی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان کی کار وہاں موجود نہ تھی، وہ چوری ہو چکی تھی۔ انھوں نے اخبار کے رپورٹر آلیورا (Roshni Olivera) کو بتایا کہ اِس کار میں میری تمام ذاتی چیزیں موجود تھیں۔ مثلاً لیپ ٹاپ، قیمتی اسٹون رِنگ، ڈی وی ڈیز (DVDs)، سی ڈیز (CDs)، شوٹنگ کے کپڑے، موبائل فون، اور پرسنل ڈائری، وغیرہ۔ مسٹر آنند نے کہا کہ میں اِن چیزوں سے جذباتی طور پر وابستہ تھا:

I was emotionally attached to them.

اِس قسم کی تفصیلات کو بتاتے ہوئے انھوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ — اِس حادثے کے بعد مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں اچانک کسی ویران جزیرے میں آ کر پھنس گیا ہوں:

I feel like I am stranded on some island (TOI, Feb 9, 2008, p. 4)

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر آخرت میں پیش آئے گا۔ موت کے پہلے کی زندگی میں آدمی ہر قسم کے ساز وسامان میں جیتا ہے۔ مکان، گاڑی، اولاد، بزنس، شہرت، بینک بیلنس، وغیرہ۔ موت کے بعد کی زندگی میں آدمی اچانک اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں پائے گا۔ یہاں وہ پوری طرح اکیلا ہوگا۔ اس کے تمام مادّی سامان اُس سے چھوٹ چکے ہوں گے۔ اُس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا۔ اُس کے آگے وہ دنیا ہوگی جہاں اُس کے لیے ابدی صحرا کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت سے پہلے آدمی اِس آنے والے دن کے بارے میں سوچ نہیں پاتا۔ موت کے بعد اچانک یہ دن آجائے گا۔ اُس وقت انسان سوچے گا، لیکن اس کا سوچنا اس کے کام نہ آئے گا۔ سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی اِس آنے والے ہول ناک دن کی تیاری کرے۔

انفرادی زلزلہ

موت بلا شبہ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ موت گویا ایک انفرادی زلزلہ ہے۔ عام زلزلہ زمین کی سطح پر واقع ہوتا ہے اور موت ایک فرد کی سطح پر پیش آتی ہے۔ جس طرح انسان زلزلے کو روکنے پر قادر نہیں، اُسی طرح کوئی شخص موت کو روکنے پر بھی قادر نہیں۔ زلزلہ بھی یک طرفہ فیصلے کے تحت بلا اطلاع آتا ہے، اِسی طرح موت بھی یک طرفہ فیصلے کے تحت کسی شخص پر وارد ہوتی ہے۔ زلزلے کو لوٹانا ممکن نہیں۔ اِسی طرح موت کو لوٹانا بھی ممکن نہیں۔ زلزلے کے مقابلے میں انسان مکمل طور پر بے بس ہوتا ہے۔ اِسی طرح موت کے مقابلے میں بھی انسان مکمل طور پر بے بس ہے۔ انسان کو کوئی ذاتی اختیار نہ زلزلے کے اوپر ہے اور نہ موت کے اوپر۔

موت قاطعِ حیات ہے، اور موت کا ذکر قاطعِ خودی۔ خودی (ego) کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ مگر یہی خودی انسان کی تمام خرابیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ خودی کی بنا پر کسی انسان کے اندر وہ شخصیت بنتی ہے جس کو خود پسند (self-centered) شخصیت کہا جاتا ہے۔ یہی وہ خود پسند شخصیت ہے جو آدمی کے اندر ذاتی بڑائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اِسی خود پسندی کا نتیجہ وہ تمام منفی اوصاف ہوتے ہیں جن کو غرور، حسد، ظلم، تشدد پسندی اور انتقام، وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

موت اِن تمام منفی جذبات کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس آدمی کو حقیقی معنوں میں موت کا زندہ شعور حاصل ہو، جو اِس حقیقت کو دریافت کرلے کہ مجھے لازماً مرنا ہے اور موت کے بعد مجھے رب العالمین کے سامنے حاضر ہونا ہے، وہ ایک کٹ ٹو سائز (cut to size) انسان بن جاتا ہے۔ ایسا انسان آخری حد تک ایک متواضع (modest) انسان ہوجائے گا۔ ذاتی بڑائی کا احساس اُس سے چھن جائے گا۔ وہ کامل طور پر عجز کے احساس میں جینے لگے گا۔ بے اعترافی کا طریقہ چھوڑ کر وہ اعتراف کا طریقہ اختیار کرلے گا۔ وہ حق کے آگے جھک جائے گا، بجائے اِس کے کہ وہ حق کو خود اپنے سامنے جھکانے کی کوشش کرے۔

موت کا زندہ تصور

31 جنوری 2010 کو میرے چھوٹے بھائی انجینئر عبد المحیط خاں (پیدائش: 1932) کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ فیض آباد میں تھے۔ ان کی عمر 77 سال تھی۔ میں نے اپنی لمبی عمر میں ہزاروں افراد کو مرتے ہوئے دیکھا ہے یا ان کی موت کی خبر سنی ہے۔ لیکن میرے بھائی کی موت میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس نے میرے اندر ایک نیا تصور پیدا کیا۔ اس کو اگر میں کوئی نام دوں تو میں کہوں گا کہ موت کا زندہ تصور (living concept of death)۔

میں نے غور کیا کہ موت کے بارے میں یہ نیا شعور میرے اندر کیوں پیدا ہوا۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ 6 بھائی بہن تھے۔ چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میرے سوا تمام بھائی بہن مر چکے ہیں۔ اِس اعتبار سے، اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اِس احساس سے مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ میرے بھائی اور بہن کل تک اِسی دنیا میں تھے جہاں کہ میں ہوں، لیکن اب وہ ایک ایک کر کے مر چکے ہیں، یہاں تک کہ 6 بہن بھائیوں میں اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ لوگ اِس دنیا سے نکل کر ایک اور دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ اب نہ وہ مجھ سے مل سکتے ہیں اور نہ میں اُن سے مل سکتا۔ موت نے مجھ کو اپنے تمام بھائی بہنوں سے ابدی طور پر جدا کر دیا۔

موت کیا ہے۔ موت ایک جبری انخلا (compulsory expulsion) کا معاملہ ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر آدمی اپنے لیے ایک دنیا بناتا ہے — گھر، جائداد، بزنس، اولاد، تعلقات، شہرت، عوامی حلقہ، عہدہ، سماجی پوزیشن، وغیرہ۔ اِن تمام چیزوں کی بنیاد پر ہر آدمی کی اپنی ایک چھوٹی یا بڑی دنیا ہوتی ہے، جس کے اندر وہ اپنے صبح و شام گزارتا ہے۔ وہ اس کو اپنی دنیا سمجھتا ہے۔ لیکن اچانک موت کا وقت آجاتا ہے اور فرشتے اس کو جبری طور پر موجودہ دنیا سے نکال کر اُس دنیا میں پہنچا دیتے ہیں، جہاں اس کے پاس اپنے ذاتی وجود کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا — موت کے واقعے کو صرف وہ شخص جانتا ہے جو اِس حقیقت کا زندہ شعور رکھتا ہو۔

موت کا سبق

17 جنوری 2010 کو جیوتی باسو (Jyoti Basu) کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 96 سال تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بڑے لیڈروں میں سے تھے۔ وہ مسلسل 23 سال تک ویسٹ بنگال کے چیف منسٹر رہے۔ ان کی وفات کا سبب ڈاکٹروں نے جسم کے کئی اعضا کا فیل ہوجانا (multi organ failure) بتایا ہے۔

انسان کو اِس دنیا میں جو جسم ملا ہے، وہ ایک مکمل نوعیت کا زندہ کارخانہ ہے۔ اِس میں بیک وقت بہت سے نظام کام کر رہے ہیں — سوچنے کا نظام، دیکھنے کا نظام، سننے کا نظام، ہضم کا نظام، حرکتِ قلب کا نظام، سانس لینے کا نظام، اعضاء کو متحرک کرنے کا نظام، وغیرہ۔

یہ تمام نظام نہایت متوافق طور پر عمل کرتے ہیں تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی انسان ایک زندہ وجود کے طور پر دنیا میں اپنا کام کرے۔

مثلاً نظامِ حافظہ اگر کام نہ کرے تو آدمی کو کوئی بات یاد نہیں رہتی، نظامِ بصارت کام نہ کرے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے، نظامِ سماعت کام نہ کرے تو آدمی کو کچھ سنائی نہیں دیتا، نظامِ نطق کام نہ کرے تو آدمی گونگا ہو جاتا ہے، نظامِ ہضم کام نہ کرے تو آدمی کی صحت خراب ہوجاتی ہے، نظامِ حرکت کام نہ کرے تو آدمی اپاہج بن جاتا ہے۔ نظامِ تنفس کام نہ کرے تو آدمی کے لیے سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور اگر نظامِ قلب کام نہ کرے تو آدمی کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے، وغیرہ۔

موت اِس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسان کے وجود کے مختلف نظام کسی اور کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ وہ جب تک چاہے، انسان کو زندہ رکھے اور جب چاہے، انسان پر موت طاری کردے۔ ہر روز دنیا میں موت کے تقریباً ایک لاکھ واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو یہ سب سے بڑی خبر سنا رہے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے بڑی خبر ہے جس کا شعوری علم کسی زندہ انسان کو نہیں۔

موت کی یاد

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں یہ آیت آئی ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الموْتِ (3:185) ۔یعنی ہر انسان موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔موت کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ایک روایت مسند احمد، النسائی،ابن ماجہ، وغیرہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔سنن الترمذی کے الفاظ یہ ہیں: أکثروا ذکرَ ھاذم اللّذاتِ، الموت (حدیث نمبر 2460) ۔یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جولذتوں کوڈھا دینے والی ہے۔

اِس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے — موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو مبنی برخواہش سوچ کوڈھانے والی ہے، اور مبنی برحقیقت سوچ کو پیدا کرنے والی ہے:

> Remember death much. It demolishes desire-based thinking, and produces reality-based thinking.

لذت (pleasure) کو وسیع معنی میں لیا جائے تو اِس میں انسان کی تمام سرگرمیاں شامل ہوجاتی ہیں۔ ہر کام جو آدمی کرتا ہے، وہ اِسی لیے کرتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں اس کو لذت مل رہی ہوتی ہے۔معلوم مادی لذتوں کے علاوہ، وہ تمام چیزیں بھی اِس فہرست میں شامل ہیں جو بظاہر غیر مادی نظر آتی ہیں۔مثلاً عزت،شہرت، اقتدار، اسٹیج،سماجی رتبہ،مقبولیت،عوامی استقبال، وغیرہ۔غرض تمام مادی اور غیر مادی چیزیں اِس فہرستِ لذت میں شامل ہیں۔اگر لذت نہ ملے تو آدمی کوئی کام نہیں کرے گا۔

اِس طرح موت کا احساس آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو اپنا ہدف نہیں بنا سکتا جو آج ملے اور کل کے دن وہ مکمل طور پر اُس سے چھن جائے۔حقیقت یہ ہے کہ موت کی حیثیت کسی عورت یا مرد کے لیے سب سے بڑے معلم (teacher) کی ہے۔ موت کا تصور آدمی کے اندر انقلاب پیدا کر دینے والا ہے۔

بامعنی زندگی

زندگی ہر ایک کوملتی ہے۔مگر کوئی بے معنی زندگی گزار کر مر جاتا ہے اور کوئی شخص اپنی زندگی کو بامعنی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔دو انسانوں میں یہ فرق کیسے ہوتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام انسان فطرت سے یکساں صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔پھر وہ کیا چیز ہے جو ایک قسم کے دو انسانوں میں اتنا بڑا ارق پیدا کر دیتی ہے۔اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے شعور کا استعمال یا عدم استعمال۔

ایک انسان وہ ہے جو اپنے شعور کو کام میں نہ لائے بلکہ دوسروں کے زیر اثر عمل کرے۔بلکہ وہ حالات کا معمول بن کر زندگی گزارے۔اس کے گرد وپیش کے احوال اس کو جیسا بننے کے لیے کہیں وہ ویسا ہی بنتا چلا جائے۔دنیا اس کو جس سانچے میں ڈھالے، وہ اسی میں ڈھلتا چلا جائے،خواہ وہ سانچہ صحیح ہو یا غلط۔

یہ وہ انسان ہے جس کی زندگی معنویت سے خالی رہی۔وہ ایک حیوان کی طرح جیا اور ایک حیوان کی طرح مر گیا۔فطرت نے اس کو ایک بامعنی وجود کے ساتھ دنیا میں بھیجا تھا،مگر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو صرف ایک بے معنی وجود کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسرا انسان وہ ہے جس نے اپنے شعور کو زندہ رکھا۔جس نے اپنی عقل کو استعمال کیا۔اس نے آزادانہ غور وفکر کے تحت اپنے آپ کو بھی جانا اور دنیا کو بھی۔اس نے صحیح اور غلط میں فرق کیا۔اس نے اخلاقِ انسانی کے ابدی اصولوں کی پابندی کی۔اس نے ایک بااصول اور ایک باکردار انسان کی زندگی گزاری۔وہ اسی پر جیا اور اسی پر مرا۔

یہ دوسرے قسم کا انسان ہی حقیقی انسان ہے۔اس کی زندگی بھی بامعنی تھی اور اس کی موت بھی بامعنی۔

موت سے پہلے، موت کے بعد

پوری انسانی تاریخ میں انسان جس سب سے بڑی فراموشی میں مبتلا رہا ہے، وہ صرف ایک ہے، اور وہ موت کا معاملہ ہے۔ اِس معاملے میں انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ مشکل سے چند ایسے افراد دریافت کیے جاسکتے ہیں جو اِس معاملے میں فراموشی کا شکار نہ ہوں۔

موجودہ دنیا دار الامتحان (testing ground) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ سب کا سب سامانِ امتحان کے طور پر ملا ہوا ہے۔ موت اِس مدتِ امتحان کو ختم کرتی ہے۔ اِس لیے موت کے آتے ہی ہر انسان سے وہ تمام چیزیں اچانک چھن جائیں گی جو اُس کو یہاں امتحان کے طور پر ملی ہوئی تھی۔

موت کے بعد آدمی اچانک ایک نئی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ دنیا اپنے عمل کے نتائج پانے کی دنیا ہے۔ موت سے پہلے آدمی اگر سامانِ امتحان میں جی رہا تھا تو موت کے بعد اُس کو اپنے عمل کے نتائج کے درمیان جینا پڑے گا۔ موت سے پہلے کی زندگی عارضی زندگی ہے، یعنی بہ مشکل سو سال، لیکن موت کے بعد کی زندگی ابدی زندگی ہے، اُس کا کبھی خاتمہ ہونے والا نہیں۔

موت سے پہلے کی زندگی میں انسان کو بے شمار چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ تمام چیزیں پیدا ہوتے ہی اُس کو اپنے آپ حاصل ہوجاتی ہیں۔ اِس لیے آدمی اِن چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ یہ تمام عطیات اچانک اس سے منقطع ہوجائیں گے۔ موت کے بعد آدمی اچانک اپنے آپ کو اِس حال میں پائے گا کہ وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہو گیا۔

اِس سنگین حقیقت کے بارے میں سوچنا انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن آدمی بے فکری کی حالت میں پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اچانک مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ وہ اِس حدیث رسول کا مصداق بن جاتا ہے: ما رأیت مثل النار نام ھاربھا، ولا مثل الجنة نام طالبھا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2601)۔

امید پر خاتمہ

ہندستان کی فلم انڈسٹری میں رشی کیش مکھرجی (Hrisikesh Mukherjee) ایک معروف نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 27 اگست 2006 کو ممبئی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 84 سال تھی۔ اپنے آخری زمانے میں انھوں نے ممبئی کے ایک مکان میں تنہائی کی زندگی گزاری۔ ان کے ساتھ صرف اُن کا گھریلو ملازم مینو (Meno) رہ گیا تھا۔ انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ 28 اگست 2006 میں ان کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں رپورٹر نے ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

> His last stage was painful. Dialysis, ventilators were his companions for the last three months or more. More than that there were the sorrows of his personal life. His wife, his brothers, even his younger son had passed away. He lived all alone in Mumbai, with only Meno (domestic help) p. 10

مکھرجی کے ایک قریبی دوست مسٹر سین (Mrinal Sen) آخری دنوں میں ملاقات کے لیے اُن کے گھر گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ مکھرجی نے اپنے کمرے اور اپنے باتھ روم کی تمام دیواروں پر آئینے لگا رکھے ہیں۔ یہ منظر ان کو عجیب معلوم ہوا۔ انھوں نے مکھرجی سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ چلیے ہم باہر بیٹھ کر سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ باہر بیٹھ گیے۔ جب سورج غروب ہوا تو مکھرجی نے اپنا طویل سکوت توڑتے ہوئے کہا — ایک دن اور کٹ گیا:

One more day has gone by.

جب میں نے اس رپورٹ میں رشی کیش مکھرجی کا حال پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ اُس انسان کا المیہ ہے جس کو زندگی کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ جو اپنی عمر کا ایک ایک دن مایوسی کی حالت میں گزار

رہا تھا۔ اس کے برعکس حال اس انسان کا ہوتا ہے جس نے سچائی کو دریافت کیا ہو۔ جو اِس حقیقت کو جان چکا ہو کہ موت کے بعد وہ اگلے دورِ حیات میں داخل ہوگا جہاں خدا کی ابدی جنت ہے اور وہاں خدا کی رحمتیں سچے انسان کا انتظار کررہی ہیں۔ ایسا آدمی زبانِ حال یا زبان قال سے کہے گا— جنت ایک اور دن قریب آگئی:

One more day closer to Paradise.

یہ حقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت بلال کی زندگی سے معلوم ہوتی ہے۔ بلال بن رباح الحبشی نے 63 سال کی عمر میں 642 عیسوی میں وفات پائی۔ روایات میں آیا ہے کہ آخر عمر میں بلال سخت بیمار ہوئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کی بیوی کی زبان سے نکلا: واحزناہ (ہائے غم) بلال نے سنا تو کہا: واطرباہ! (ہائے خوشی) پھر انھوں نے کہا— کل میں اپنے ساتھیوں سے ملوں گا، محمد سے اور ان کے گروہ سے (غدا ألقى الأحبه محمدا وحزبه)۔ الشفالقاضی عیاض، عمان، 1407ھ، 2/53

مذکورہ دنوں واقعات کے درمیان یہ فرق بتاتا ہے کہ حقیقت سے بے خبر انسان اور حقیقت سے باخبر انسان کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو نہ جانتا ہو کہ بعد از موت بھی زندگی ہے جس کو اگلے دورحیات کی خبر نہ ہو، وہ چند دن کے لیے موجودہ دورِ حیات میں بظاہر خوش نظر آتا ہے لیکن جب وہ بوڑھا ہوتا ہے اور وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو اسکا احساس یہ ہوتا ہے کہ آگے اس کے لیے تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ احساس اس کو مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے پاس ناامیدی کے سوا کوئی اور سرمایا نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جس کو سچائی کی دریافت ہوگئی ہو۔ جو خدا کی تخلیقی اسکیم (creation plan) کو جان چکا ہو۔ جس کو یہ معلوم ہو کہ قبل ازموت دورِحیات میں اُس کو خدا رُخی زندگی (God-oriented life) گزرانا ہے، تاکہ بعد ازموت دورِ حیات میں وہ اس کے انعام کے طور پر خدا کی ابدی جنت میں جگہ پائے۔ ایسے آدمی کے لیے زندگی اُمیّد سے بھرا ہوا ایک

تجربہ ہے۔ وہ امیک کے ساتھ جیتا ہے اور امید کے ساتھ موت کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے انسان کے لیے مایوسی کا کوئی سوال نہیں، نہ حال کی زندگی میں اور نہ مستقبل کی زندگی میں۔

موجودہ زمانے میں صنعتی انقلاب نے انسان کو ہر قسم کی آسائش کا سامان دے دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر آدمی تناؤ (tension) اور اسٹریس (stress) میں جیتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ جدید صنعتی انقلاب اس کو قبل ازموت زندگی کے لیے تو بہت کچھ دے رہا ہے۔ لیکن یہ انقلاب نہ اس کو موت سے بچاتا ہے، اور نہ اس کو موت کے بعد کی زندگی کے لیے کوئی امید افزا پیغام دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کو ذہنی تناؤ میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

آخري پيشي

ایک شریر آدمی نے موقع پا کر ایک بزرگ کے مکان پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے مزید یہ کیا کہ بزرگ کے اوپر جھوٹے مقدمے قائم کردیے تاکہ وہ دباؤ میں آ کر اس کے ناجائز قبضہ کو مان لیں۔ عدالت کی پیشیاں ہونے لگیں، اور بزرگ کی توجہ اور پیسہ غیر ضروری طور پر اس میں ضائع ہونے لگے۔ تاہم بزرگ اس سے پریشان نہیں ہوئے۔ مذکورہ شخص سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: ''یاد رکھو، آخری پیشی خدا کے یہاں ہونے والی ہے''۔

موجودہ دنیا میں انسان کا حال یہ ہے کہ وہ جھوٹی تدبیریں کرکے دوسرے کے مال پر قبضہ کرتا ہے، اور پھر قہقہہ لگاتا ہے۔ وہ فرضی کارروائیاں کرکے دوسرے کی جائداد اپنے نام لکھوالیتا ہے، اور پھر اپنے دوستوں میں اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے، گویا اس نے کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ مگر اس قسم کی فتوحات اور کامیابیاں جھوٹی فتوحات اور کامیابیاں ہیں۔ وہ خدا کے یہاں پیشی کے وقت اتنی بے معنی ثابت ہوں گی کہ آدمی کے پاس الفاظ بھی نہ ہوں گے کہ وہ اپنی حمایت میں کچھ بول سکے۔ وہ وہاں خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کرے گا، اگرچہ اس وقت اعتراف کرنا، اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

سانس کا کاروبار

دہلی میں ہمارے محلے میں ایک صاحب تھے۔لوگ ان کو ملّاجی کہتے تھے۔ وہ بھینس پالتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دوستی ایک ہندو تاجر سے تھی۔ ان کے یہاں لوہے کا کاروبار تھا۔ایک بار ایسا ہوا کہ ملاجی کی ایک بھینس مرگئی۔ وہ اپنے ہندو دوست سے ملے۔ اس سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میری ایک بھینس مرگئی۔ یہ سن کر لوہے کے ہندو تاجر نے کہا کہ ملاجی، تمھارا تو سانس کا کاروبار ہے۔آیا آیا، نہ آیا۔یعنی ایک بھینس صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ اُس کا سانس چل رہا ہے۔سانس اگر رک جائے تو بھینس کی زندگی بھی ختم ہوجائے گی۔ مذکورہ تاجر نے یہ بات ملّاجی کے کاروبار کے بارے میں کہی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر زندہ انسان کا معاملہ یہی ہے۔ مذکورہ تاجر کو کہنا چاہیے تھا— ملاجی، ہمارا اور تمھارا معاملہ تو سانس کا معاملہ ہے۔آیا آیا، نہ آیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسان کے جسم میں مختلف قسم کے نظام ہیں جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر ایک وہ نظام ہے جس کو نظامِ تنفس (respiratory system) کہا جاتا ہے۔ یہ نظام انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ نظامِ تنفس جب تک کام کررہا ہے، انسان زندہ ہے۔ یہ نظام اپنا کام نہ کرے تو انسان چند منٹ کے اندر مر جائے گا۔

کسی آدمی پر جب موت آتی ہے تو آخر وقت میں اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ اِس حالت کو غرغرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ انسان کا نظامِ تنفس معتدل حالت میں اپنا کام کرنا بند کردیتا ہے اُس وقت انسان کے گلے سے عجیب قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ چند منٹ تک یہ آواز آتی ہے، اس کے بعد انسان پر وہ حالت طاری ہوجاتی ہے جس کو موت کہا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی موت خود اپنی موت کی یاددہانی ہے۔ ہر موت زندہ لوگوں کو بتاتی ہے کہ جس طرح مرنے والا مرگیا، اُسی طرح زندہ رہنے والا بھی مرے گا۔ ہر موت یاد دلاتی ہے کہ اے لوگو، مستقبل کی تیاری کرو، کیوں کہ آخر کار جو چیز تمھارے حصے میں آنے والی ہے، وہ تمھارا مستقبل ہے، نہ کہ تمھارا ماضی اور حال۔

زندگی کا خاتمہ

26 ستمبر 2008 کو نئی دہلی کے پارلیامنٹ انکسی میں ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اِس پروگرام کو نئی دہلی کے ایف۔ اے۔ این۔ ایس (Foundation for Amity & National Solidarity) نے آرگنائز کیا تھا۔ اس کے صدر لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر سوم ناتھ چٹرجی تھے۔ اِس موقع پر مشہور جنرلسٹ خشونت سنگھ (پیدائش: 1915) کو نیشنل ایمٹی ایوارڈ دیا گیا۔ اسٹیج سے مسٹر خشونت سنگھ کے تعارف میں جو تقریر ہوئی، اُس میں بتایا گیا کہ زندگی کے بارے میں مسٹر خشونت سنگھ کا نظریہ ہے:

Enjoy good things in life.

مگر خود مسٹر خشونت سنگھ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اِس نظریے کی زندہ تردید بنے ہوئے تھے۔ تقریباً 95 سال کی عمر کو پہنچ کر وہ بہت کم زور ہو چکے تھے، وہ جھک کر چلتے تھے، ان کے اوپر مایوسی چھائی ہوئی تھی، چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ انسان، دنیا میں انجوائے کرنے کا نظریہ بناتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے مقدر ہے کہ وہ بہت جلد انجوائے کرنے کے قابل ہی نہ رہے:

Enjoy good things in life only to become so weak that you are unable to enjoy anything.

یہ صرف ایک شخص کی کہانی نہیں، یہی پوری تاریخ کی کہانی ہے۔ ہر زمانے میں انسان کا یہی حال ہوا ہے کہ وہ اپنے لیے خوشیوں کا ایک محل بنانا چاہتا ہے، لیکن آخر میں بڑھاپا آتا ہے اور اس کے سارے منصوبے کو ناکام کر دیتا ہے۔

یہاں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے۔ لیکن انسان اپنی سوچ پر نظر ثانی نہیں کر پاتا، یہاں تک کہ مایوسی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، حالاں کہ اگر وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کی زندگی ٹریجڈی (المیہ) کے بجائے، کامیڈی (طربیہ) میں بدل جائے۔ اس کا خاتمہ امید پر ہو، نہ کہ ناامیدی پر۔

خاتمۂ حیات

ایک ایسے انسان کو لیجئے جو 50 سے زیادہ عمر پا کر مرا ہو۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کے تکمیلی مرحلہ میں ہوتا ہے۔ علم، تجربہ، اور تیاری کے مختلف مراحل سے گزر کر اس وقت وہ ایک پختہ انسان بن چکا ہوتا ہے۔ عین اس وقت موت کا فرشتہ آتا ہے اور اس کو اس طرح صفحۂ سے مٹا دیتا ہے جیسے کہ وہ باغ حیات کا ایک غیر مطلوب درخت تھا جس کو بے رحمانہ طور پر کاٹ دیا گیا۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زیادہ پختہ دماغ سے سوچے۔ وہ زیادہ معنویت کے ساتھ کائنات کے نغموں کو سنے، وہ زیادہ لطافت کے ساتھ دنیا کے ذائقوں کو چکھے۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ زیادہ کامیاب کلام کرے۔ زیادہ اعلی نوعیت کی تحریریں تخلیق کر سکے۔ وہ ان تمام کاموں کو زیادہ معیاری سطح پر انجام دے جن کو اپنی ناپختگی کی بنا پر اب تک وہ صرف غیر معیاری انداز میں انجام دے رہا تھا۔

یہی اس دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔ یہاں ہر انسان صرف اپنے مرحلۂ نشو ونما تک زندہ رہتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی زندگی کے آخری تکمیلی مرحلہ میں پہنچتا ہے تو وہ انتہائی بے بسی کے ساتھ اپنی زندگی کی کہانی کا یہ المناک منظر دیکھتا ہے کہ اس کو اچانک اسٹیج سے ہٹا دیا گیا۔

تاہم زندگی کا یہ انجام صرف اس وقت ایک المیہ ہے جب کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھا جائے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ وہ ایک نئے دورِ حیات کا آغاز ہے۔ اس تصور کے مطابق زندگی کا موجودہ مرحلہ گویا کہ تربیتی مرحلہ ہے اور موت کے بعد کا مرحلہ تربیت یافتہ صلاحیتوں کے استعمال کا مرحلہ۔

جو لوگ اس حقیقت کو پالیں ان کے لئے موجودہ تربیتی مرحلہ بھی بامعنی ہے اور بعد کا مرحلہ بھی بامعنی۔ جب کہ وہ تربیت یافتہ انسان کی حیثیت سے آخرت کے اعلیٰ مواقع کو استعمال کر کے اپنے لیے ایک پر مسرت زندگی کی تعمیر کر سکیں گے۔

منصوبۂ حیات

آہ، زندگی مجھے صرف ایک بار ملی تھی، مگر میں کیسا نادان تھا کہ اس ایک بار ملی ہوئی زندگی کو بھی میں نے کھودیا —— یہ احساس ایک ناقابل برداشت درد بن کر اس وقت آدمی کے اوپر چھا جائے گا جب کہ وہ موجودہ مرحلۂ حیات سے گزر کر موت کے دروازہ پر پہنچے گا۔

یہاں وہ اپنے ایک دورِ حیات کا خاتمہ اور اپنے دوسرے دورِ حیات کا آغاز دیکھے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جہاں وہ اپنے قیام کی مدت پوری کر چکا۔ اور اس کے آگے وہ آخرت ہوگی جہاں اب اس کو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لیے داخل کر دیا جائے۔ اس وقت آدمی سوچے گا کہ دنیا کی زندگی کی صورت میں اس کو کتنا قیمتی موقع ملا تھا جس کو استعمال کر کے وہ اپنے اخروی مستقبل کی تعمیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس موقع کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکا۔ یہ تلخ یاد حسرت کا ایک سلگتا ہوا آتش فشاں بن کر آدمی کے سینہ میں دہکتا رہے گا اور اس کے بعد کبھی وہ ٹھنڈا نہ ہوگا۔

جو آدمی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اس کے لئے سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خالق کے منصوبہ کو سمجھے۔ انسان کیوں پیدا ہوتا ہے۔ کیوں اس کو مختلف قسم کا سامانِ حیات دیا جاتا ہے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ ایک محدود مدت گزار کر ہر آدمی لازمی طور پر موت سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب کیوں ہے۔ زندگی کے اس نقشہ کی معنویت کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا ہے۔ کون سی روش کامیابی کی طرف لے جاتی ہے اور کون سی روش ناکامی کی طرف۔ ان باتوں کو جاننا ہر آدمی کا پہلا مسئلہ ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔ غریب ہو یا امیر۔ کمزور ہو یا طاقتور۔ وہ اہم شخصیت ہو یا غیر اہم شخصیت۔ ہر حال میں اور ہر ایک کے لیے یکساں طور پر یہ سوال سب سے بڑا سوال ہے۔ اور اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس کی سب سے پہلی ترجیح۔

ہر آدمی پر لازم ہے کہ وہ موت سے پہلے خالق کے منصوبۂ حیات کو جان لے۔ موت سے پہلے اس کو جاننا راہ عمل کو جاننا ہے اور موت کے بعد اس کو جاننا نتیجۂ عمل کو جاننا۔

موت: ایک عالم گیر قانون

نباتات، حیوانات اورانسان، تینوں موت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہر درخت آخر کار اپنی سرسبزی کھو دیتا ہے۔ ہر جانور پر ایک وقت آتا ہے جب کہ وہ ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک روز مرجاتا ہے۔ موت اس دنیا کا ایک عالم گیر قانون ہے، جس سے کوئی بھی ذی حیات مستثنیٰ نہیں۔ مگر دوسری ذی حیات اشیاء کے برعکس، یہ صرف انسان ہے جو یہ جانتا ہے کہ کسی بھی لمحہ اس کی زندگی ختم ہوجائے گی۔ اور اگر اس کو زندگی کی پوری متوقع مدت مل جائے تب بھی لازماً اس کا جسم تنزل کا شکار ہوگا اور مقرر وقت پر وہ مرجائے گا۔

Unlike other living creatures, he knows that his life may be cut short at any moment and that, even if he attains the full expectation of a human life, his growth is bound to be followed by eventual decay and, in due time, death. (18/411)

تمام ذی حیات اشیاء میں صرف انسان کے اندر موت کا تصور ہونا بے حد با معنی ہے۔ یہ استثناء بتاتا ہے کہ موت کا معاملہ انسان کے لیے اس سے مختلف ہے جو دوسری ذی حیات اشیاء کے لئے ہے۔ دوسری ذی حیات اشیاء کے لیے موت ایک بے خبری کا واقعہ ہے اور انسان کے لیے مکمل طور پر باخبری کا واقعہ۔ انسانی موت کی یہ استثنائی نوعیت اشارہ کررہی ہے کہ انسان کے لیے موت کے ساتھ شعورِ موت بھی درکار ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موت کا وقت آنے سے پہلے موت کے بارے میں سوچے، اور اس کا سامنا کرنے کے لیے پہلے سے تیاری کرے۔ دوسری ذی حیات اشیاء کے لیے موت سادہ طور پر خاتمۂ حیات کے ہم معنی تھی، اس لئے ان کو اس کا شعور دینے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر انسان کے لیے موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے دور حیات کا آغاز ہے۔ اسی لئے ضروری ہوا کہ انسان کو پیشگی طور پر اس مرحلۂ حیات سے آگاہ کردیا جائے تا کہ وہ اس کے لئے ضروری تیاری کرسکے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ شعور کی موت مرے نہ کہ جانوروں کی طرح محض بے شعوری کی موت۔

زندگی المیہ کیوں

شیلے (P. B. Shelley) ایک انگریز شاعر تھا۔ اس کی وفات 1822 میں ہوئی۔ وہ پُردرد شاعری کے لیے مشہور ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے — ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غم ناک خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں:

Our sweetest songs are those that tell of saddest thought

ایسا کیوں ہے؟ اِس کا سبب یہ ہے کہ بیشتر لوگ اِس احساس میں جیتے ہیں کہ زندگی اُن کے لیے ایک المناک تجربہ تھی۔ وہ جو کچھ پانا چاہتے تھے، اُس کو وہ نہ پا سکے۔ وہ اپنے آپ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ناکام انسان سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی درناک نغمہ سنتے ہیں، یا کوئی دردناک کہانی پڑھتے ہیں، تو وہ اپنی محروم نفسیات کی بنا پر اُس کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت واقعہ کا بیان ہے۔ اِس کے برعکس جب وہ بظاہر کوئی پُرمسرت نغمہ سنتے ہیں یا پُرمسرت کہانی پڑھتے ہیں تو وہ اس کو اپنے احساس کی بنا پر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ایک غیر واقعی بات ہے۔ لوگوں کی اِس نفسیات کا سبب کیا ہے؟ اُس کا سبب یہ ہے کہ لوگ خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کو سمجھے بغیر، اپنی زندگی کا منصوبہ بناتے ہیں۔ وہ اپنے لئے ایک ایسی چیز پانا چاہتے ہیں جس کا حصول خالق کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، اِس دنیا میں ممکن نہیں۔ یہی تضاد، مذکورہ صورتِ حال کا اصل سبب ہے۔

خالق کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، موجود دنیا میں انسان اپنے لیے صرف بقدر ضرورت پا سکتا ہے، اِس سے زیادہ نہیں۔ ایسی حالت میں انسان اگر بقدر ضرورت پر قناعت کرے، تو وہ مذکورہ نفسیات سے بچ سکتا ہے۔ خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق انسان کو چاہئے کہ وہ موجودہ دنیا میں صرف بقدر ضرورت چاہے، اور اس سے زیادہ کو آخرت کی چیز سمجھے — یہی موجودہ دنیا میں پُرسکون زندگی کا واحد راز ہے۔ فطری زندگی کا نام پُرمسرت زندگی ہے اور غیر فطری زندگی کا نام مسرت سے خالی زندگی۔

قیامت دستک دے رہی ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ اپنے خاتمہ (end) پر پہنچ گئی ہے۔ اکیسویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی آخری صدی ہے۔ اِس کے بعد انسان کے اوپر شاید بائیسویں صدی آنے والی نہیں۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ برائی اپنی آخری حدتک پہنچ چکی ہے، اور جب برائی اپنی آخری حدتک پہنچ جائے تو انسان، خدا کی زمین پر مزید بسنے کا جواز (justification) کھو دیتا ہے۔

اِس معاملے میں غیر مسلموں کو جانچنے کا معیار اخلاقی معیار ہے۔ اخلاقی معیار کے اعتبار سے، آخری چیز حیا ہے۔ جب لوگوں کے اندر حیا کی صفت باقی نہ رہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ برائی کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ہم جنسی (homosexuality) کو یکساں جنس (same sex) قرار دے کر اس کو قانونی طور پر جائز بنایا جارہا ہے۔ عریانیت (nudity) اور فحّاشی (pornography) اب کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ آرٹ اور آزادی کے نام پر ہر اخلاقی برائی کو جواز کا درجہ دیا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال، اخلاقی شناعت کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ جب انسان اخلاقی برائی کے اِس درجے تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لیے خدا کی زمین پر مزید بسنے کا جواز ختم ہوجاتا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اِس معاملے میں ان کے لیے جو معیار ہے، وہ شرعی معیار ہے۔ اِس شرعی معیار کو قرآن اور حدیث میں انکارِ منکر کہا گیا ہے، یعنی جب کچھ افراد برائی میں مبتلا ہوں تو دوسرے لوگ اس کی سخت مذمت کریں۔ وہ کھلے طور پر اس کو کنڈَم کریں۔ برائی کو دیکھنے یا جاننے کے بعد اُس پر خاموش رہنا اور اس کی کھلی مذمت نہ کرنا، ایک ایسا فعل ہے جو پوری قوم کو لعنت کا مستحق بنادیتا ہے۔ یہ بات قرآن اور حدیث میں واضح طور پر موجود ہے، حتی کہ یہ معاملہ اتنا سخت ہے کہ اگر دوسرے لوگ اِس طرح کی برائی کے معاملے میں اعلان کے ساتھ اُس سے اظہارِ برأت (disown) نہ کریں تو نسل در نسل وہ اُس برائی میں شامل سمجھے جائیں گے، وہ اُس وقت تک بری الذمہ قرار نہیں پائیں

گے، جب تک وہ اعلان کے ساتھ اُس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار نہ کریں۔ دونوں ہی طبقے کا کیس مشترک طور پر شدید بے حسی کا کیس ہے۔ ایک طبقے میں اِس بے حسی کا اظہار اخلاقی بے حیائی کی صورت میں ہورہا ہے اور دوسرے طبقے میں انکارِ منکر کے فریضے کو ترک کرنے کی صورت میں۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں انکارِ منکر نہ کرنے کی صفت آخری حد تک عام ہوچکی ہے۔ جدید میڈیا نے اس معاملے میں مسلمانوں کا عالمی ایکسپوژر (universal exposure) کردیا ہے۔ یہ بم دھماکے کے واقعات ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمان جگہ جگہ بم دھماکے کررہے ہیں۔ عرب دنیا میں فلسطین کے اِشو کو لے کر بم دھماکے کیے جارہے ہیں۔ اِسی طرح، پاکستان اور افغانستان اور کشمیر میں بم دھماکے جاری ہیں۔ آج کل ہندستان میں بھی جگہ جگہ بم دھماکے ہورہے ہیں۔ اِن بم دھماکوں میں بے قصور لوگ مرتے ہیں، جب کہ بے قصور لوگوں کو مارنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک بے قصور کو مارنا گویا کہ تمام انسانوں کو مار ڈالنا ہے (المائدۃ :32)۔

اِس قسم کے بم دھماکے لمبی مدت سے جگہ جگہ ہورہے ہیں، مگر معلوم طور پر ساری دنیا میں کوئی بھی نہیں جو اِن واقعات پر حقیقی معنوں میں انکارِ منکر کا فریضہ انجام دے رہا ہو، یعنی غیر مشتبہ انداز میں اور متعین طور پر ایسے لوگوں کی مذمت کرنا۔ مسلمانوں میں جو لکھنے اور بولنے والے لوگ ہیں، وہ جب بھی لکھتے اور بولتے ہیں، وہ اِس انداز میں لکھتے اور بولتے ہیں جس سے ایسے مسلمانوں کو سندِ جواز مل جائے، یعنی ٹوسٹ (twist) کرکے بولنا، قیاس کی بنیاد پر کلام کرنا، غیر متعین اور غیر مشخص انداز میں تبصرہ کرنا، سرے سے واقعے کا انکار کرنا، ایسے واقعات کو پولس اور میڈیا کی سازش بتانا، مسلمانوں کے فعل پر اُن کی مذمت کرنے کے بجائے اس پر خاموش رہ کر اسلامی تعلیمات کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہے، وغیرہ۔ مسلمان، شرعی معیار کی بنیاد پر اِس دنیا میں اپنے لیے حقِ زیست کھو چکے ہیں، اور غیر مسلم، اخلاقی معیار کی بنیاد پر یہ ثابت کررہے ہیں کہ اُنھیں اِس دنیا میں مزید مہلتِ حیات ملنے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قیامت ہمیں دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوجائے۔

قیامت کا تجربہ

میرا ایک سفر کیسا بلانکا (مراکو) کے لیے ہوا تھا۔ 25 نومبر 1984 کی شام کو جہاز نے مجھے کیسا بلانکا (Casablanca) کے ائرپورٹ پر اتار دیا۔ اُس وقت میں اکیلا تھا۔ یہاں ایک عجیب تجربہ پیش آیا۔ مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔ کانفرنس کی طرف سے مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تو بھیج دیا گیا تھا، لیکن کیسا بلانکا میں مقامِ اجتماع کا کوئی پتہ میرے پاس نہ تھا۔ میرے پاس منتظمینِ کانفرنس کا کوئی نمبر بھی نہ تھا جس کے ذریعے میں اُن سے رابطہ قائم کرسکوں۔

میں ائرپورٹ پر اترا تو وہاں کانفرنس کا کوئی آدمی مجھے رسیو (receive) کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ ائرپورٹ کے مختلف لوگوں سے میں نے جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ فرانسیسی زبان بولتے ہیں، وہ نہ عربی زبان سمجھتے تھے اور نہ انگریزی زبان۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں یہاں ایک بے جگہ شخص (displaced person) بن گیا ہوں۔ یہاں نہ میرا کوئی ساتھی ہے، نہ میرے لیے قیام کی کوئی جگہ ہے، نہ میرے لیے زندگی کے دوسرے سامان۔ محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے ایک اجنبی جگہ ہے اور یہاں میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔

پریشانی کے عالم میں میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا، لیکن کوئی شخص وہاں میری مدد کرنے والا نہیں ملا۔ آخر کار میں اِسی پریشانی کی حالت میں ائرپورٹ کے باہر آ گیا۔ یہاں میں ایک اجنبی انسان کی طرح کھڑا ہوا تھا، اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے نظر آیا کہ ایک آدمی سڑک کے دوسری طرف سے چل کر میری طرف آ رہا ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور اردو زبان میں مجھ سے بات کرنے لگا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان ہیں اور یہاں کسی سروس کے تحت رہتے ہیں۔ اُن کو میرے حالات سن کر مجھ سے ہمدردی ہوئی۔ وہ فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ وہ مجھ کو لے کر ائرپورٹ میں واقع پولیس کے دفتر میں گئے۔ انھوں نے پولس والوں سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ پولس والوں نے کہا کہ اِس بارے میں ہمارے پاس کچھ زیادہ

معلومات نہیں ہیں، البتہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ کیسا بلانکا کے ہوٹل ''سفیر'' میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ اِس کے بعد مذکورہ پاکستانی مسلمان نے کہا کہ میں صرف یہ کرسکتا ہوں کہ آپ کو اپنی گاڑی میں لے چلوں اور ہوٹل ''سفیر'' کے باہر اتار دوں۔ چناں چہ انھوں نے مجھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور ہوٹل سفیر کے گیٹ پر مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

میں ڈرتے ہوئے ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے کانفرنس کے بعض افراد مل گئے جو مجھ کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں میرے لیے ایک کمرہ رِزرو (reserve) ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے مجھ کو ہوٹل کا کارڈ دے کر میرے کمرہ میں پہنچا دیا۔ مذکورہ واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا، وہ میرے لیے قیامت کا ایک محدود تجربہ تھا۔ آدمی پیدا ہونے کے بعد اپنے ماں باپ اور اپنے رشتے داروں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جہاں اس کو فطرت کی طرف سے ایک مکمل قسم کا لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ملا ہوا ہے۔ آدمی اپنا ایک گھر بناتا ہے اور اپنے لیے تمام ضروری ساز وسامان کی ایک دنیا تعمیر کرتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بنائی ہوئی دنیا میں آزادی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ اچانک ایک سنگین واقعہ پیش آتا ہے۔ یہ موت کا واقعہ ہے۔ موت آدمی کو اس کی بنائی ہوئی دنیا سے مکمل طور پر جدا کر کے ایک اور دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں وہ اُن چیزوں سے محروم ہوجاتا ہے، جن کے درمیان وہ اپنی تمام ضروریات پوری کرتے ہوئے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے دوست اور رشتے دار بھی اُس سے مکمل طور پر جدا ہوجاتے ہیں۔ اِس دوسری دنیا میں آدمی تنہا بھی ہوتا ہے اور پوری طرح بے سروسامان بھی۔

میرے ساتھ جو یہ تجربہ گزرا، وہ میرے لیے اِسی قسم کا ایک محدود تجربہ تھا۔ یہ موت کے بعد آنے والی دنیا کی ایک جُزئی تصویر تھی۔ اگلی دنیا کی اِس قسم کی جزئی تصویر کبھی نہ کبھی ہر انسان کو دکھائی جاتی ہے، تاکہ وہ موت کے بعد سامنے آنے والے حالات کا پیشگی تعارف حاصل کرلے اور اس کے لیے ضروری تیاری کرسکے۔

یہ بے خبر انسان

راجیش کھنہ انڈیا کی فلم انڈسٹری (بالی ووڈ) سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پہلی فلمی شخصیت ہیں جن کو سپر اسٹار (super star) کا ٹائٹل دیا گیا۔ جس زمانے میں راجیش کھنہ اپنے پروفیشن میں عروج پر تھے، انھوں نے کہا تھا کہ — میں خدا کے بعد سب سے بڑی ہستی ہوں:

Being at the top, Rajesh Khanna once said, is a feeling of being next to God.

عجیب بات ہے کہ جس سال راجیش کھنہ کی پیدائش ہوئی، اُسی سال مشہور امریکی باکسر محمد علی کلے (Muhammad Ali Clay) کی پیدائش ہوئی، یعنی 1942 میں۔ محمد علی کلے کو باکسنگ (boxing) میں بہت بڑا درجہ ملا۔ وہ باکسنگ کے عالمی چیمپین بن گئے۔ اُس وقت انھوں نے کہا تھا کہ — میں بادشاہِ عالم ہوں، میں سب سے بڑا ہوں:

I am the king of the world, I am the greatest.

مگر دونوں کا انجام یکساں طور پر برعکس صورت میں ہوا۔ راجیش کھنہ لمبی بیماری کے نتیجے میں آخر کار ہڈی کا ڈھانچہ بن گئے اور صرف 69 سال کی عمر میں 18 جولائی 2012 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ محمد علی کلے ابھی زندہ ہیں، لیکن طویل مدت سے وہ پارکنسن کی بیماری (Parkinson's syndrome) میں مبتلا ہیں۔ اب وہ بالکل معذور (disabled) ہو کر وھیل چیر پر اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار رہے ہیں۔

یہی ہمیشہ سے انسان کا حال رہا ہے۔ جب بھی کسی کو غیر معمولی حیثیت یا کوئی بڑی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو قرآن کے الفاظ میں، وہ 'أکرمن' کی نفسیات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ خدا کا شکر کرنے کے بجائے اپنے آپ کو خدا کا ہم سر سمجھ لیتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ حقیر ہو کر مرتے ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ بعد کے انسان پچھلے انسانوں کے انجام سے سبق نہیں لیتے۔

موت کی یاد: ایک صحت مند عمل

ایک اسٹڈی کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ موت کے بارے میں سوچنا ایک اچھی عادت ہے۔ وہ تندرستی کے لیے مفید ہے۔ اِس کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی اپنی ترجیحات اور اپنے نشانے کو دوبارہ قائم کرتا ہے۔ ایک نئے سائنسی تجزیے میں بتایا گیا ہے کہ اگر آدمی کسی قبرستان سے گزرے، تب بھی وہ غیر شعوری طور اُس سے سبق لیتا ہے اور اس کے اندر مثبت تبدیلی آتی ہے اور اس کے اندر دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اِس سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ موت کے بارے میں سوچنا خطرناک ہے، اِس سے تخریبی ذہن پیدا ہوتا ہے۔ موت کی یاد سے تعصب اور تشدد کا جذبہ ابھرتا ہے۔

Thinking about death boosts health: Thinking about death can actually be a good thing as an awareness of mortality can improve physical health and help in prioritizing one's goals and values, as new study has revealed. According to a new analysis of recent scientific studies, even non-conscious thinking about death like walking by a cemetery could prompt positive changes and promote helping others. Past research suggests that thinking about death is destructive and dangerous, fuelling everything from prejudice and greed to violence. (*The Times of India*, New Delhi, Apr 21, 2012, p. 21)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ موت کے بارے میں سوچنے سے عمل کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اِس سے آدمی کے اندر منفی سوچ پیدا ہوتی ہے، مگر یہ صرف ایک قیاسی بات تھی۔ اِس مسئلے کا باقاعدہ علمی مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ معاملہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے بارے میں سوچنا ایک اچھی عادت ہے۔ اِس سے آدمی کے اندر صحت مند صفات پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن میں آیا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الموْتِ (3:185) یعنی ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: أكثروا ذكر هادم اللذات،

الموت (الترمذی، حدیث نمبر 2307)۔یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، وہ لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔موت کی یاد حقیقتِ حیات کی یاد ہے۔موت کی یاد آدمی کو بتاتی ہے کہ اس کے پاس لامحدود وقت نہیں۔کسی بھی لمحہ وہ وقت آسکتا ہے، جب کہ اس کی موجودہ زندگی ختم ہوجائے۔

اِس طرح موت کی یاد آدمی کے اندر جلدی کا احساس (sense of urgency) پیدا کرتی ہے۔آدمی کے اندر یہ محرک (incentive) پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام کو جلد پورا کرے، کیوں کہ کچھ معلوم نہیں کہ کب وقت ہوجائے اور کام کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔اِس طرح موت کی یاد آدمی کو منصوبہ بند عمل کرنے پر ابھارتی ہے۔اور منصوبہ بند عمل بلا شبہ زندگی میں سب سے بڑی چیز ہے۔موت کی یاد آدمی کے اندر ذہنی بیداری (intellectual awakening) کی صفت پیدا کرتی ہے۔موت کی یاد آدمی کی چھپی ہوئی ذہنی صلاحیتوں کو جگاتی ہے۔موت آدمی کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کے مطابق، موت کی یاد کا فائدہ بے شمار گُنا بڑھ جاتا ہے۔اسلامی نظریۂ حیات بتاتا ہے کہ آدمی کی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔موت کے بعد ایک اور زندگی ہے جو کہ ابدی طور پر قائم رہنے والی ہے۔آدمی موت سے پہلے کے دور حیات میں جیسا عمل کرے گا، اُسی کے مطابق، وہ موت کے بعد کے دورِ حیات میں کامیاب یا ناکام رہے گا۔ یہ احساس آدمی کے اندر مقصدیت کا شعور پیدا کرتا ہے۔وہ زیادہ بامعنی انداز میں زندگی گزارنے کے قابل بن جاتا ہے۔

عام تصور کے مطابق، موت کی یاد صرف موت کی یاد ہے، یعنی خاتمہ حیات کی یاد۔لیکن اسلامی تصورِ حیات کے مطابق، موت کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بعد از موت دورِ حیات کے لیے تیاری کرے وہ آج کی زندگی کو ایک موقع (opportunity) سمجھے، جب کہ وہ بعد کو آنے والے ابدی دورِ حیات کے لیے عمل کرسکتا ہے یہ تصورِ موت آدمی کو اِس حقیقت کی یاد دلاتا ہے: زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اب یہ آدمی کے اپنے اوپر ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کامیاب بناتا ہے یا ناکام۔وہ اِس پہلے اور آخری موقع کو استعمال کرتا ہے یا وہ اُس کو کھودیتا ہے۔

ذہنی سکون کا راز

چارلس ڈیوک (Charles Mass Duke Jr.) ایک امریکی خلاباز (astronaut) ہیں۔ وہ 1935 میں امریکا (North Carolina) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسپیس سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ 1966 میں ناسا (NASA) کے پانچویں خلاباز گروپ کے لیے منتخب کیے گئے۔ انھوں نے خلا (space) میں کئی پروازیں کیں۔ 1972 میں انھوں نے اپالو (Apollo-16) کے ذریعے چاند کا سفر کیا۔ 16 اپریل 1972 میں وہ چاند کی سطح پر اُترے۔

21 فروری 2008 کی شام کو ہماری ٹیم کے دو ممبر ڈاکٹر چارلس ڈیوک سے نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل میں انٹرویو کے لیے ملے۔ ملاقات کے وقت انھوں نے اپنے دست خط کے ساتھ اپنی ایک تصویر دی۔ اِس تصویر میں وہ خلائی سوٹ میں چاند کی سطح پر کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ہماری ٹیم کے مذکورہ دونوں ممبروں نے امریکی خلاباز ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو کا موضوع اسپریچولٹی (spirituality) تھا۔ انٹرویو کے دوران اُن سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں، اور آپ کو پُرمسرت زندگی حاصل ہے۔ اِس کے جواب میں انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ — ابتدائی طور پر میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ چاند مجھ کو سکون دے گا۔ میں نے یہ سمجھا کہ خلابازی کی زندگی مجھے سکون عطا کرے گی۔ میں خلاباز بن گیا، مگر خلابازی کی زندگی نے مجھ کو سکون نہیں دیا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اپنا کیریر بدل دوں۔ میں نے ناسا میں ایسٹروناٹ کا جاب چھوڑ دیا اور بزنس شروع کر دیا۔ میں نے کافی دولت کمائی، مگر اب بھی میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب بھی میری زندگی میں کوئی چیز مفقود ہے:

> I had no peace in life. I thought the moon would give me peace. I thought all these goals, all these accomplishments, this great career would give me peace, but it didn't, So I thought I'll change career. So I left NASA as an astronaut

and went into business. Imade a lot of money but I still had no peace in my life. There was still something missing.

New Delhi, Charlse Duke Jr.
February 21, 2008

یہ معاملہ صرف ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا نہیں، یہی موجودہ زمانے میں تمام لوگوں کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانے میں دولت اور شہرت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ لوگ نہایت تیزی کے ساتھ اِن چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اِن چیزوں کو پانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سپر اچیورس (super achievers) کہا جاتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ تمام سپر اچیور کا کیس سپر ناکامی (super failure) کا کیس تھا۔ سب کچھ پانے کے باوجود اِن لوگوں کو داخلی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ مایوسی کا احساس لے کر مر گئے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ اِس صورتِ حال نے موجودہ زمانے میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والے (super achievers) کہا جاتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ہر بڑی کامیابی آخر میں صرف بڑی ناکامی (super failure) بن گئی۔ اِس قسم کے لوگ نئے قسم کے سنگین مسائل میں مبتلا ہو گئے۔ مثلاً مہلک بیماریاں، وغیرہ۔

اِنھیں نئے مسائل میں سے ایک ٹنشن (tension) یا اسٹریس (stress) ہے۔ لوگوں کے پاس دولت اور شہرت اور اقتدار سب کچھ موجود ہے، لیکن اِن ظاہری کامیابیوں کے باوجود لوگ مسلسل طور پر ٹنشن اور اسٹریس میں مبتلا رہتے ہیں۔ زیادہ دولت صرف زیادہ بیماری کا سبب بن رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ رسرچ میڈیکل سائنس میں ہو رہی ہے، تاکہ نئی نئی بیماریوں کا علاج دریافت کیا جا سکے۔ اِس صورتِ حال کے نتیجے میں ایک نیا بزنس شروع ہو گیا ہے جس کو ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کہا جاتا ہے۔ اِن اداروں میں بڑے بڑے ماہرین، لوگوں کو اسٹریس سے نجات دینے کے لیے سرگرم ہیں۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ لوگوں کا

ٹنشن اور اسٹریس بدستور بڑھتا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا خطرہ تیسری عالمی جنگ کا خطرہ نہیں ہے، بلکہ ٹنشن اور اسٹریس کا خطرہ ہے۔

یہ صورتِ حال ہم کو قرآن کی ایک آیت کی یاد دلاتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28) اِسی بات کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں فرمایا: اللھم لا عیش إلا عیش الآخرہ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2961)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے برتر ہی کو اپنا سپریم کنسرن (supreme concern) بنانے سے انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اپنی پسند کی جو زندگی انسان چاہتا ہے، وہ صرف موت کے بعد کے دورِ حیات میں کسی انسان کو ملے گی۔ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں کسی کو اپنی پسند کی زندگی ملنے والی نہیں۔

اِس معاملے کا براہِ راست تعلق خالق کے کریشن پلان (creation plan of God) سے ہے۔ خالق نے موجودہ دنیا کو امتحان گاہ (testing ground) کے طور پر بنایا ہے۔ موجودہ دنیا کسی کے لیے بھی اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی جگہ نہیں بن سکتی۔ موجودہ دنیا ہر عورت اور مرد کے لیے سفر کا مرحلہ ہے، اور بعد کو آنے والی آخرت کی دنیا اس کی ابدی منزل ہے۔

آپ، بس یا ٹرین یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں اور اس کے اندر آپ گھر والی سہولتیں حاصل کرنا چاہیں، تو آپ اس کو حاصل نہ کرسکیں گے۔ کیوں کہ سواری صرف سواری ہے، وہ گھر کا بدل نہیں۔ اِس طرح موجود دنیا میں خواہشوں کی تکمیل (fulfillment) کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ جو آدمی اپنی خواہشوں کی تکمیل چاہتا ہو، اس کو آخرت کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)۔

موت سے پہلے جو شخص جنت کو شعوری طور پر پالے
وہی موت کے بعد جنت کو مادی طور پر پائے گا

موت کی یاد کا مثبت پہلو

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أکثروا ذکر هادم اللذات، الموت (الترمذي، رقم الحديث: 2307) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

اِس حدیث میں ھادم (ڈھا دینے والا) کا لفظ سلبی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ ایجابی معنی میں ہے، یعنی موت کی یاد صرف موت کی یاد نہیں، بلکہ اس کا ایک بہت بڑا مثبت پہلو ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موت اِس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں مٹ جانے والی ہیں، اِس لیے تم دنیا کی لذتوں کے بجائے، آخرت کی لذتوں کو اپنی سوچ کا مرکز بناؤ، کیوں کہ آخرت کی لذتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں (فاثروا ما یبقیٰ علی ما یفنیٰ)۔

انسان ایک لذت پسند مخلوق ہے۔ انسان ہر دور میں اپنی لذتوں کی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں لذت کے سامان بہت محدود تھے۔ موجودہ زمانے میں لذت کے سامانوں کی کثرت ہوگئی ہے۔ اِس اعتبار سے، موجودہ زمانے کو کنزیومرازم (consumerism) کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں کنزیومرازم کا دور آیا تو انسان مزید اضافہ کے ساتھ اپنی لذتوں کی تسکین حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

مگر تاریخ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اِس معاملے میں انسان کا کیس کامل محرومی کا کیس ہے، انسان نہ قدیم روایتی زمانے میں تسکین کا سامان حاصل کرسکا، اور نہ جدید کنزیومرازم کے زمانے میں۔ گویا اِس دنیا میں طالب موجود ہے، مگر یہاں اس کا مطلوب موجود نہیں۔ جس آدمی کا شعور زندہ ہو، اس کے لیے موت اس بات کی یاد دہانی بن جائے گی کہ جس مطلوب کو میں قبل از موت دور میں نہ پاسکا، وہ مطلوب خالق کے پلان کے مطابق، موت کے بعد کے دور میں رکھ دیا گیا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے موت کا تصور اس کی زندگی کے کورس کو متعین کرنے والا بن جائے گا۔

کوئی چیز ملکیت نہیں

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں :یَقول العبدُ: مالي، مالي، إنما له من ماله ثلاثٌ :ما أكلَ فأفنى، أو لبسَ فأبلى، أو أعطَى فاقتنَى، وما سِوَى ذلك فهو ذاهب، وتاركُه للناسِ (حدیث نمبر 2959) یعنی بندہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال۔ حالاں کہ اُس کے مال میں اس کے لئے صرف تین چیزیں ہیں— جو اس نے کھایا اور ختم کر دیا یا جو اس نے پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا جو اس نے صدقہ کیا اور وہ اس کے لئے ذخیرۂ آخرت بن گیا۔اس کے سوا جو ہے، وہ بہر حال چلا جانے والا ہے اور وہ اس کو لوگوں کے لئے چھوڑ دینے والا ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے، اور وہ دنیا میں زندگی گزارتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس کچھ سامان حیات ہے جو بظاہر اس کا اپنا ہے۔ وہ کوئی معاشی کام کرتا ہے جس کے ذریعے وہ کچھ مال کماتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میری کمائی ہے۔ مال یا مال کے ذریعے حاصل کی ہوئی چیزوں کے بارے میں اس کا یہ ذہن بنتا ہے کہ یہ تمام چیزیں میری اپنی ہیں، میں ان کا مالک ہوں، مجھے حق ہے کہ میں جس طرح چاہوں ان کو استعمال کروں۔

لیکن موت آدمی کے اس خیال کی مکمل تردید کر دیتی ہے۔ موت بتاتی ہے کہ آدمی کے پاس کوئی بھی چیز اس کی ذاتی چیز نہیں، اس کی کوئی بھی ملکیت اس کے پاس ہمیشہ ساتھ رہنے والی نہیں۔ موت آدمی کو اس کے مال اور اس کے تمام اسباب سے جدا کر دیتی ہے۔ موت کے بعد آدمی اچانک اکیلا ہو جاتا ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو دریافت کر لے، وہ اپنے مال کو یا اپنے اسباب کو اس طرح استعمال کرے گا جو موت کے بعد کی زندگی میں اس کے کام آنے والا ہو۔ اس حقیقت کو جانے بغیر اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جاننے کے بعد اس کی زندگی آخرت رخی زندگی بن جاتی ہے۔ یہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو ہر آدمی کو جاننا چاہیے۔

موت سے بے خبری کیوں

میں آل انڈیا ریڈیو سُن رہا تھا۔ اُس پر ایک انڈین رائٹر کا ریکارڈ کیا ہوا انٹرویو آرہا تھا۔ چند مہینے پہلے اِس رائٹر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی موت کے بعد جب میں نے دوبارہ ریڈیو پر اس کی آواز سنی، تو اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ رائٹر پہلے موجودہ دنیا میں بول رہا تھا، اب وہ دوسری دنیا میں چلا گیا ہے اور وہاں سے بول رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں ریکارڈ کی ہوئی آواز علامتی طور پر اِس حقیقت کا مظاہرہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی عمر کے ایک دَور سے نکل کر، اپنی عمر کے دوسرے دور میں پہنچ جاتا ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ علمِ انسانی کے تمام شعبے اِس بات کی تصدیق کررہے ہیں کہ موت کے بعد انسان ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ کسی نہ کسی صورت میں دوبارہ زندگی پالیتا ہے۔ مثلاً حیاتیاتی سائنس کے جدید مطالعے کے مطابق، انسان کا جسم ایک سوٹریلین سے زیادہ سیل (cells) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ سیل مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے سیل آتے رہتے ہیں۔ جسم کے اندر یہ عمل مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ گویا کہ انسان جسمانی اعتبار سے ہر چند سال کے بعد مرجاتا ہے اور دوبارہ زندگی پالیتا ہے۔

بار بار کی جسمانی موت کے باوجود انسان کی شخصیت (personality) بدستور قائم رہتی ہے۔ مثلاً انسان کا حافظہ (memory) جیسے پہلے تھا، ویسا ہی وہ بعد کو باقی رہتا ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ جسم کسی انسان کی صرف ایک سواری (vehicle) ہے۔ سواری بدل جاتی ہے، لیکن انسان کی شخصیت بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہتی ہے۔ اِس حقیقت کو حیاتیات کے ایک مغربی عالم نے اِن الفاظ میں بیان کیا:

Personality is changelessness in change.

ایسی حالت میں انسان پر موت کا وارد ہونا، صرف یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ انسان سفر کرکے موجودہ دنیا

سے ایک اور دنیا میں پہنچ گیا۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو انسان کو موت کے بارے میں بہت زیادہ سوچنا چاہیے، بلکہ اُس کو سب سے زیادہ موت ہی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ کیوں کہ موت ایک نئی دنیا کی طرف چھلانگ ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ انسان، موت کے بعد کے صورتِ حال کے لیے تیاری کرے۔ اس کی سوچ ہر اعتبار سے موت رُخی سوچ (death-oriented thinking) بن جائے۔

موت کسی آدمی کے لیے سب سے زیادہ یقینی واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر آدمی کو بار بار موت کی یاد دہانی کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے گھر میں اور اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کی موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی شخص موت کو لے کر نہیں سوچتا۔ ہر آدمی اِس طرح زندگی گزار رہا ہے، جیسے کہ اُس کو مرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو ہمیشہ کے لیے اِسی دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص نہ مرے۔ اِس کے باوجود انسان موت کے واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ وہ موت کی حقیقت کا اعتراف صرف اُس وقت کرتا ہے، جب کہ خود اُس پر موت آجائے۔ اور مجبورانہ فیصلے کے تحت وہ موت کے دروازے میں داخل ہو جائے۔

ایک آدمی جب سفر کرتا ہے، خواہ اُس کا سفر ٹرین سے ہو، یا کار سے ہو، یا ہوائی جہاز سے ہو، تو وہ اِس سوچ کے تحت سفر کرتا ہے کہ چند گھنٹے کے بعد اُس کا سفر ختم ہو جائے گا اور وہ ایک نئے مقام پر پہنچ جائے گا۔ اِس مقصد کے تحت وہ اپنے سفر کی تیاری کرتا ہے۔ وسیع تر معنوں میں انسان کا معاملہ بھی ایک سفر کا معاملہ ہے۔ ہر انسان زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے، لیکن کوئی بھی شخص اِس دوسرے سفر کے معاملے میں موت کو لے کر نہیں سوچتا۔ ہر آدمی اس طرح اپنی زندگی کا سفر طے کر رہا ہے جیسے کہ یہی سفر اُس کے لیے ابدی سفر ہے، وہ اِسی موجودہ صورت میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

میرا آبائی وطن اعظم گڑھ (یوپی) ہے۔ آزادیٔ ہند سے پہلے کے دور میں وہاں ایک راجا ہَر کھ چند تھے۔ انھوں نے شہر کے مین روڈ پر اپنے لیے ایک بہت بڑی کوٹھی بنوانی شروع کی۔ نقشے کے مطابق، یہ ایک تین منزلہ کوٹھی تھی۔ چوتھی منزل پر ایک خصوصی کمرہ تھا جس میں اُنھیں اپنی اہلیہ کے ساتھ قیام کرنا تھا۔ اِس کوٹھی میں انھوں نے بہت زیادہ پیسہ خرچ کیا۔ یہ بہت مضبوط قسم کی

ایک قلعہ نما کوٹھی تھی۔ اس کی دیواروں اور چھت پر ہر طرف نہایت اعلیٰ پیمانے پر آرٹ ورک کیا گیا تھا۔ یہ کوٹھی بہت لمبی مدت تک بنتی رہی، یہاں تک کہ اُس کی آخری تکمیل سے پہلے 1946 میں راجا ہرکھ چند کا انتقال ہو گیا، اور وہ اِس کوٹھی میں قیام نہ کر سکے۔

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کا منصوبہ اِس طرح بناتا ہے، جیسے کہ اس کو ابدی طور پر اپنے اِس منصوبے کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ جیسے کہ اس کے اور اُس کی اِس بنائی ہوئی دنیا کے درمیان کبھی جدائی ہونے والی نہیں۔

یہ ایک سنگین سوال ہے کہ تمام انسان موت کے بارے میں کیوں اتنا زیادہ غافل رہتے ہیں۔ وہ وسروں کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن خود اپنی موت کے بارے میں اُنھیں کبھی خیال نہیں آتا۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ جب کسی آدمی کی تدفین کے بعد قبرستان سے لَوٹتے ہیں، تو اُس وقت خدا کا ایک فرشتہ قبر کے پاس آتا ہے۔ وہ قبر کی مٹی اٹھا کر لوٹنے والے لوگوں کی طرف پھینکتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ غافل ہو جاؤ، جاؤ دوبارہ تم اپنی دنیا میں مشغول ہو جاؤ(لله تعالى ملك موكل بالمقابر فإذا دفن الميت وسوى عليه وتحولوا الينصرفوا؛ قبض قبضة من تراب القبر فرمى بها أقفيتهم وقال:انصرفوا إلى دنياكم وانسوا موتاكم) الحبائک في أخبار الملائك للسيوطي، لبنان، 1985، 1/112۔

اِس حدیثِ رسول میں تمثیل کی زبان میں ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ یہ تمثیل کی زبان میں فرشتوں کی طرف سے گویا کہ ایک نکیر ہے۔ لوگ ایک انسان کو اپنے سامنے مرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ اس کی تجہیز اور تکفین میں شریک ہوتے ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان جو زمین میں چل پھر رہا تھا، وہ قبر میں دفن ہو گیا، لیکن اِس واقعے سے وہ اپنے لیے کوئی سبق نہیں لیتے۔ موت کے اِس واقعے سے پہلے وہ جس طرح غفلت کی زندگی گزار رہے تھے، اُسی قسم کی غفلت کی زندگی وہ اب بھی گزارتے رہتے ہیں۔ یہی واقعہ پوری تاریخ میں پیش آ رہا ہے۔ ساری انسانی تاریخ میں کچھ استثنائی افراد کو چھوڑ کر، کوئی انسان نظر نہیں آتا جو موت کے معاملے کو گہرائی کے ساتھ سمجھے اور اُس سے اپنے لیے سبق لے۔

اِس عمومی غفلت کا راز کیا ہے۔ یہ راز پروگریمنگ (programming) کے نظریے سے سمجھ میں آتا ہے۔ پروگریمنگ کا مطلب ہے کسی معاملے کی پیشگی طور پر طے شدہ ترتیب:

A pre-arranged plan of procedure.

سائنسی مطالعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، وہ خود اپنے ذہن کی پروگریمنگ کے تحت کرتا ہے۔ یہ پروگریمنگ فطری طور پر ہر انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً بھوک لگنا، پیاس لگنا، نیند آنا، وغیرہ، سب اپنے ذہن کی فطری پروگریمنگ کے تحت پیش آتے ہیں۔ آدمی کی یہ صفت ہے کہ وہ ہمیشہ پرو پروگریمنگ (pro-programming) کے تحت سوچتا ہے، وہ اینٹی پروگریمنگ (anti-programming) کے تحت نہ سوچتا ہے اور نہ عمل کرتا ہے۔ اینٹی پروگریمنگ سوچ دراصل اینٹی سیلف سوچ کا نام ہے، اور اینٹی سیلف سوچ بلاشبہہ تمام کم یاب چیزوں میں سب سے زیادہ کم یاب چیز ہے۔ یہ پروگریمنگ حالات کے زیر اثر جزئی طور پر بدل سکتی ہے، لیکن شعوری طور پر اپنی پروگریمنگ کے خلاف سوچنا، انتہائی حد تک ایک دشوار کام ہے۔

میرے ساتھ ایسا ہوا کہ ایک بار میں مانچسٹر (انگلینڈ) گیا۔ وہاں میں لمبی مدت تک مقیم رہا۔ مانچسٹر ایسے جغرافی علاقے میں ہے، جہاں کبھی رات لمبی ہوتی ہے اور دن چھوٹا، اور کبھی دن لمبا ہوتا ہے اور رات چھوٹی۔ میں جس زمانے میں وہاں گیا تھا، اس زمانے میں وہاں رات بہت چھوٹی ہوتی تھی اور اس کے مقابلے میں دن زیادہ لمبا۔ چناں چہ ایسا ہوتا تھا کہ ہم نے مغرب کی نماز ادا کی، اس کے جلد ہی بعد عشا کا وقت آ گیا، اور پھر عشا کی نماز کے بعد جلد ہی فجر کا وقت آ گیا۔ اِس طرح رات کو وہاں سونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہاں ہم رات کے وقت جاگتے تھے اور دن کے وقت سوتے تھے۔

چناں چہ مقامی حالات کے دباؤ کے تحت، مانچسٹر کے زمانۂ قیام میں سونے اور جاگنے کے بارے میں میرے ذہن کی پروگریمنگ وقتی طور پر بدل گئی۔ پھر جب میں انڈیا واپس آیا، تو اِس بدلی ہوئی پروگریمنگ کی بنا پر مجھے یہاں رات کو نیند نہیں آتی تھی، بلکہ دن کو نیند آتی تھی۔ یہ صورتِ حال ایک عرصے تک باقی رہی۔ اس کے بعد میری پروگریمنگ اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آئی۔

جیسا کہ معلوم ہے، کمپیوٹر میں پروگریمنگ کا طریقہ رائج ہے۔ جیسی پروگریمنگ کی جاتی ہے، اسی کے مطابق، کمپیوٹر اپنا کام کرتا ہے۔ یہی معاملے زیادہ بڑے پیمانے پر انسانی دماغ کا ہے۔ فطرت کی طرف سے اِس طرح ہر انسانی دماغ کی پروگریمنگ کردی گئی ہے۔ اس کے مطابق، ہر عورت اور مرد اپنی زندگی کے تمام کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ اِسی حال میں جیتے ہیں اور اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

ہر انسان صرف محدود یت تک جیتا ہے اور اس کے بعد وہ مرجاتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کوئی بھی انسان موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ہر عورت اور مرد بار بار دوسروں کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن وہ اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ کئے رہتے ہیں۔ دوسروں کو مرتا ہوا دیکھنے کے باوجود ہر آدمی اِس احساس میں جیتا ہے، جیسے کہ خود اُس پر موت آنے والی نہیں۔

اِس کا سبب پروگریمنگ کا معاملہ ہے۔ فطرت نے انسانی دماغ کی جو پروگریمنگ کی ہے۔ اس میں سب کچھ ہے، لیکن ایک چیز اس پروگریمنگ میں موجود نہیں، اور وہ موت ہے۔ انسانی دماغ کی پروگریمنگ میں بھوک ہے، پیاس ہے، نیند ہے اور دوسری تمام چیزیں ہیں، لیکن پروگریمنگ کی اِس فہرست میں موت سرے سے شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان اس طرح جیتا ہے جیسے کہ اس پر موت آنے والی نہیں۔ اپنے داخلی شعور کے اعتبار سے ہر آدمی ابدیت (eternity) کے احساس میں جیتا ہے۔ اپنے ذاتی احساس کے اعتبار سے ہر آدمی اپنے آپ کو ابدی مخلوق سمجھتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات کی منصوبہ بندی اس طرح کرتا ہے، جیسے کہ اس کو ہمیشہ کے لیے موجودہ دنیا میں رہنا ہے۔

اِس معاملے میں انسان کی مثال ایک ایسے کمپیوٹر کی ہے جس کی پروگریمنگ میں موت (death) کا لفظ یا اس کا تصور شامل نہ کیا گیا ہو۔ ایسا کمپیوٹر آپ کو ہر بات بتائے گا، لیکن جہاں تک موت کا تعلق ہے، وہ اس بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔ کمپیوٹر اپنی پروگریمنگ کے مطابق کام کرتا ہے۔ کوئی لفظ یا کوئی تصور جو کمپیوٹر کی پروگریمنگ میں شامل نہ کیا گیا ہو، اگر آپ اُس لفظ یا

تصور کے بارے میں کمپیوٹر سے سوال کریں، تو کمپیوٹر اُس کا جواب نفی کی صورت میں دے گا۔ مثلاً کمپیوٹر کی اسکرین پر یہ جملہ لکھا ہوا سامنے آجائے گا :

Your search did not match any document.

ڈی این اے (DNA) حیاتیاتی سائنس کی ایک نئی شاخ ہے۔ موجودہ زمانے میں اُس پر بہت زیادہ کام ہوا ہے اور انسانی شخصیت کے بارے میں انوکھی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ڈی این اے کا فُل فارم یہ ہے:

Deoxyribonucleic Acid

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ڈی این اے، یا جینٹک کوڈ (genetic code) میں کسی انسان کی شخصیت کے بارے میں تمام چھوٹی اور بڑی معلومات درج ہوتی ہیں۔ کوئی انسان کیسے دیکھے گا، کیسے سنے گا، کیسے مسکرائے گا، کیسے کلام کرے گا وغیرہ، تمام معلومات پوری تفصیل کے ساتھ اُس میں کیمیائی حروف (chemical letters) کی صورت میں درج رہتی ہیں۔ یہ معلومات انسانی زندگی کے تقریباً تین نلین مختلف موضوعات (3 billion different subjects) سے متعلق ہوتی ہے۔ ایک انسان کے جنیٹک کوڈ میں اتنی زیادہ معلومات ہوتی ہیں کہ اُن کو اگر ڈی کوڈ (decode) کر کے لکھا جائے تو اس کے لیے موجودہ انسائکلو پیڈیا بریٹانکا جیسی انسائیکلو پیڈیا کی ایک ہزار جلدیں درکار ہوں گی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کسی انسان کے جنیٹک کوڈ میں انسائکلو پیڈیائی معلومات ہونے کے باوجود اُس میں موت (death) کے بارے میں کچھ بھی موجود نہیں۔ انسانی شخصیت کے اِس دفتر میں اُس کے بارے میں تمام تفصیلات درج ہیں، لیکن اُس میں موت کا کوئی اندراج نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موت کے معاملے کو خدا نے انسان کی اپنی اختیاری دریافت کے خانے میں رکھ دیا ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی پروگریمنگ سے باہر نکل کر اپنی موت کے بارے میں سوچے اور اس کے مطابق، اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔

نیند کی مثال لیجیے۔ نیند اور موت کے درمیان ایک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اِس فطری حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: النّوم أختُ الموت (نیند موت کی بہن ہے)۔ کسی شخص کو جب نیند آتی ہے تو وہ بے خبر ہو جاتا ہے، اِس طرح موت بھی بظاہر آدمی کو بے خبر کر دیتی ہے۔ لیکن نیند اور موت کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ نیند کا وقت ہر ایک کے لیے مقرر ہے، لیکن موت کا معاملہ کسی کے لیے اِس طرح کی توقیتِ فطری (natural timing) کے ساتھ مقرر نہیں، موت بالکل نامعلوم طور پر اچانک آجاتی ہے۔ کوئی بچپن میں مرجاتا ہے، کسی کی موت جوانی میں آتی ہے اور کسی کی موت بڑھاپے میں۔

نیند اور موت کا یہ فرق ایک گہری حقیقت کو بتا رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ نیند ہر آدمی کی پروگریمنگ کا فطری حصہ ہے، لیکن موت آدمی کی پروگریمنگ کا فطری حصہ نہیں۔ موت جب بھی آتی ہے، خدا کے براہِ راست فیصلے کے تحت آتی ہے۔ یہ خدا ہے جو خود اپنے فیصلے کے تحت، کسی کی موت کو مقدم کر دیتا ہے اور کسی کی موت کو مؤخر۔ موت کا تعلق نہ آدمی کی اپنی سوچ سے ہے، اور نہ اس کی فطری پروگریمنگ سے۔

جب کسی شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو اِس کا مطلب خاتمۂ حیات نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ظاہری موت کے باوجود اصل انسان اُس وقت بھی زندہ ہوتا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ موت دراصل ایک منتقلی (transfer) کا معاملہ ہے۔ موت اُس خصوصی لمحے کا نام ہے، جب کہ انسان ایک مرحلۂ حیات (period of life) سے گزر کر دوسرے مرحلۂ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسافر اگلے اسٹیشن پر ایک سواری کو چھوڑ دے اور اس کے بعد دوسری سواری کے ذریعے اپنا مستقل سفر جاری رکھے۔

پروگریمنگ کے اِس ظاہرہ (phenomenon) کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بارے میں انسان کی غفلت کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ انسان اپنے روزمرّہ کے سفر کی پلاننگ ٹائم لمٹ (time limit) کو دھیان میں رکھتے ہوئے کرتا ہے، لیکن زندگی کا سفر جو بظاہر

موت پر ختم ہورہا ہے، اس کی پلاننگ وہ اِس عام اصول کے مطابق نہیں کرتا۔ کوئی عورت اورمرد اپنی زندگی کا سفر وقت پر مبنی پلاننگ (time based planning) کے تحت نہیں کرتے، یعنی وہ اِس طرح نہیں سوچتے کہ چند دن میں تو مرنا ہے، پھر زیادہ سامان اکھٹا کرنے کی کیا ضرورت۔ وہ تکاثُر (more and more) کی نفسیات میں جیتے جیتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اچانک مرجاتے ہیں۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی ایسا ہی ہورہا ہے۔

یہ معاملہ اُس وقت سمجھ میں آتا ہے جب کہ خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کی روشنی میں اس کا مطالعہ کیا جائے۔ الہامی علم (revealed knowledge) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خدا نے جب انسان کو پیدا کیا تو پہلے ہی دن اس کو ابدی صورت میں پیدا کیا۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو پہلے ہی دن اس کو ابدی صورت میں پیدا کیا۔ خدا نے انسان کو ایک لامحدود مائنڈ دیا اور اس میں ہر قسم کی معلومات بھر دیں۔ ڈی این اے (DNA) کے جدید مطالعے سے یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہورہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک انسانی دماغ میں جو اعصاب (nerves) ہیں، وہ اتنے زیادہ ہیں کہ اگر ان کو پھیلایا جائے تو گلوب کے چاروں طرف ان کو تقریباً 25 بار لپیٹا جا سکتا ہے۔ اِس تخلیق کے مطابق، ہر انسان پیدائشی طور پر یہ شعور لے کر پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک ابدی وجود ہے۔ اس کا سفر موت پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ ہر انسان اسی ابدیت کے شعور میں جیتا ہے۔ داخلی احساس کے تحت ہر انسان کی شخصیت ابدیت کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

اِس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خالق نے بطور واقعہ انسانی فطرت کی جو پروگریمنگ کی ہے، وہ ابدیت (eternity) کے حوالے سے کی ہے، یعنی جینے کے معاملے میں انسان کی جو نفسیات ہوتی ہے، وہ اُس سے مکمل طور پر مختلف ہوتی ہے جو ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر کے وقت ہوتی ہے۔ ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں انسانی ذہن کی پروگریمنگ محدود وقت کو لے کر ہوتی ہے۔ جب کہ زندگی کے معاملے میں انسانی ذہن کی پروگریمنگ زمان اور مکان کی

محدودیت سے بالکل ماورا (beyond time and space) ہوتی ہے۔

نیچر کی یہی پروگریمنگ موت کے بارے میں انسان کی موجودہ نفسیات (psyche) کا اصل سبب ہے۔ انسان انسان جب بھی کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ اس کے لیے اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایک اجنبی واقعہ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی فطرت کی پروگریمنگ اس کو بتا رہی ہوتی ہے کہ میں ایک ابدی شخصیت (eternal personality) رکھنے والا آدمی ہوں۔ اِس طرح اپنے بارے میں اس کا شعورِ ابدیت (sense of eternity) اِس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ موت کے اِس خارجی واقعے کو اپنے اوپر منطبق (apply) کرے۔ وہ اپنی نفسیات کے تحت ایسے کسی واقعہ کو ''غیر'' کا واقعہ (someone else's phenomenon) سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایسی حالت میں زندگی کی صحیح منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر اینٹی پروگریمنگ سوچ پیدا کرے۔ وہ خود اپنے خلاف سوچنے کی صلاحیت کا ثبوت دے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ وہ پروگریمنگ کے اِس معاملے سے اوپر اٹھے۔ وہ اپنی زندگی کے قبل از موت دور، اور بعد از موت دور میں فرق کرے، اور پھر اپنی زندگی کے لیے مبنی بر حقیقت منصوبہ بندی کر سکے۔ اِس طرزِ فکر کو ایک لفظ میں انفصالی طرزِ فکر (detached thinking) کہا جا سکتا ہے۔ ایک شاعر نے اِس قسم کی سوچ کو تجرید تصور کا نام دیا ہے۔ اس کا شعر یہ ہے:

کرتا ہوں تجھے غیر کی محفل سے جُدا یاد　　　ہے داد کے قابل، میری تجرید تصور

اِس فطری نقشے کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ کسی انسان کے لیے اپنی زندگی کی مطابقِ واقعہ منصوبہ بندی صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ اس کی منصوبہ بندی مبنی بر موت منصوبہ بندی (death-based planning) ہو، یعنی وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اِس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرے کہ اس کا عرصۂ حیات (life span) موت سے پہلے کے دَور سے لے کر موت کے بعد کے دور تک پھیلا ہوا ہے۔ تمثیل کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زندگی کسی انسان کے لیے ایک عارضی سفر ہے، اور موت گویا وہ اسٹیشن ہے جہاں اتر کر وہ اپنے مستقل دورِ حیات میں پہنچنے والا ہے۔

اِس اصول کو سامنے رکھ کر جب غور کیا جائے تو الہامی علم (revealed knowledge) دوبارہ ہم کو رہ نمائی دیتا ہے۔ اِس رہ نمائی کے مطابق، موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات تیاری کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلۂ حیات تیاری کے مطابق اپنا مستقل انجام پانے کا مرحلہ۔ گویا کہ ہماری موجودہ زندگی ایک قسم کے امتحان ہال میں گزر رہی ہے۔ یہاں کی ہر چیز پرچۂ امتحان (test paper) ہے۔ یہاں جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آتا ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا، وہ سب کا سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے پرچۂ امتحان ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی چیز جو انسان کو ملتی ہے، وہ اُس کے لیے نہ انعام ہے اور نہ سزا۔ انعام اور سزا دونوں کا معاملہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات سے متعلق ہے، وہ موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات سے متعلق نہیں۔

یہی انسانی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ ہر عورت یا مرد کو اِسی حقیقت کے مطابق، اپنی زندگی کا نقشہ بنانا ہے۔ فطرت کی پروگریمنگ کے مطابق، انسان موجودہ زندگی ہی کو اپنی مستقل زندگی سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ موجودہ زندگی صرف ایک عارضی زندگی ہے۔ جس طرح کوئی طالبِ علم عارضی طور پر امتحان ہال میں کچھ وقت گزارتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنی اصل زندگی کی طرف لوٹ جاتا ہے، اِسی طرح انسان موجودہ دنیا میں عارضی طور پر آیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی اصل دنیا کی طرف لوٹ جائے گا۔

موجودہ دنیا میں مبنی بر حقیقت منصوبہ بندی کے لیے اینٹی پروگریمنگ سوچ یا آؤٹ آف پروگریمنگ سوچ کی ضرورت ہے۔ بظاہر یہ ایک بے حد مشکل کام معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اینٹی پروگریمنگ سوچ ایک دوطرفہ سوچ کا نام ہے۔ اِس میں آدمی کو ایک طرف موجودہ عارضی مدتِ حیات کے اعتبار سے سوچنا پڑتا ہے، اور عین اُسی وقت ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بعد از موت ابدی مدتِ حیات کے اعتبار سے سوچے۔ مگر یہ دوطرفہ سوچ انسان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ انسانی دماغ کی صلاحیت (capacity) اتنی زیادہ ہے کہ وہ ہر قسم کی متضاد سوچ کا احاطہ کرسکتا ہے۔ اِسی حقیقت کو ایک برطانی مفکر (Walt Whitman) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

I am large enough to contain all these contradictions.

انسان کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کے دوسرے معاملات میں اِسی متضاد طرزِ فکر کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اینٹی پروگریمنگ سوچ انسان کے لیے کوئی ناممکن سوچ نہیں، وہ ہر عورت اور مرد کے لیے پوری طرح ممکن ہے۔ اب ہر عورت اور مرد کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنی موجودہ عارضی زندگی کو کس نہج پر گزارتا ہے، ایسے نہج پر جو اُس کو اپنے ابدی دورِ حیات میں جنت میں پہنچانے والا ہے، یا جہنم میں۔ جدید تہذیب مادّی راحت (material comfort) کے تصور پر قائم ہے۔ جدید تہذیب کے تحت انسانی زندگی کا جو نقشہ بنا ہے، اُس میں صرف آج (today) کا تصور ہے، اُس میں کل (tomorrow) کا تصور نہیں۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ — خوب کام کرو اور خوب عیش کرو:

Work hard, party hard

اِس جدید ذہن کا کلمہ یہ ہے — ابھی اور اِسی وقت (right here, right now)۔ موجودہ زمانے میں اِس نظریے پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ جدید میڈیا تمام تر اِسی تصور پر چلایا جاتا ہے۔ بطور مثال یہاں صرف ایک آرٹکل کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (27 جنوری 2008) میں ایک آرٹکل اِس موضوع پر چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے کا نام ڈونا (Donna Devane) ہے۔ یہ آرٹکل حسب ذیل عنوان کے تحت مذکورہ اخبار میں شائع ہوا ہے:

Be happy here and now.

زندگی کو کامیاب بنانے کا یہ تصور فطرت کے نقشے کے بالکل خلاف ہے۔ ڈی این اے (DNA) اور جنیٹک کوڈ (genetic code) کے مطابق، انسان کی زندگی پورے معنوں میں ایک ابدی زندگی ہے۔ وہ آج سے لے کر کل تک پھیلی ہوئی ہے۔ فطرت کے تخلیقی نقشے کے مطابق، یہ ایک خطرناک قسم کا ناقص تصورِ حیات ہے کہ آج کو لیا جائے اور کل کے بارے میں کچھ نہ سوچا جائے۔ جب ڈی این اے کی دریافت بتاتی ہے کہ انسان ایک مسلسل حیاتیاتی سلسلے کا نام ہے، تو انسان کے لیے مفید طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا نقشہ ابدیت (eternity) کو لے کر بنائے، نہ

کہ صرف وقتی لمحہ (moment) کو لے کر۔

یہ ایک عام بات ہے کہ لوگ دوسروں کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سوچ پاتے کہ مجھے خود بھی مرنا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ آخر وقت تک موت کو بھولے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اچانک اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

اِس معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔ روسی کرنجیا (Russy Karanjia) انڈیا کے ایک مشہور صحافی تھے۔ وہ پارسی فیملی میں پیدا ہوئے۔ وہ سنسنی خیز صحافت (sensational journalism) کے امام تھے۔ ان کو فرینک مورس، شیام لال اور خشونت سنگھ کے درجے کا صحافی سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے دوسری عالمی جنگ میں وار کرسپانڈنٹ (war correspondent) کا کام کیا تھا۔ انھوں نے 1941 میں اپنا ہفت روزہ انگریزی اخبار بلٹز (Blitz) جاری کیا۔ اُن کے اخبار پر یہ ماٹو (motto) لکھا رہتا تھا:

Free, Frank, and Fearless

روسی کرنجیا کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ مثلاً جواہر لال نہرو، مارشل ٹٹو، صدر جمال عبدالناصر اور ایران کے رضا شاہ پہلوی، وغیرہ۔ اُن پر دو بار ہارٹ اٹیک ہوا۔ یکم فروری 2008 کو ان کی موت بمبئی کے ایک اسپتال میں ہوئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 92 سال تھی۔ ٹائمس آف انڈیا (2 فروری 2008) کی رپورٹ کے مطابق، اپنی موت سے پہلے انھوں نے جس واحد احساس کا ذکر کیا، وہ یہ تھا:

The only thing he complained about was that, the nurses skirts were not short enough.

روسی کرنجیا اُس وقت بسترِ مرگ پر تھے۔ اُس وقت وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن اُس وقت بھی اُن کے دماغ میں جو چیز چھائی ہوئی تھی، وہ یہ کہ اسپتال کی نرسوں کا اسکرٹ زیادہ چھوٹا نہ تھا جس سے اُن کے جسم کے زیادہ حصّے دکھائی دیں۔ حالاں کہ اُس وقت بطور حقیقت یہ چاہیے

تھا کہ وہ موت کے بعد والے حالات کو سوچیں۔ اِس بے شعوری کا سبب یہ تھا کہ موت کے بعد والے حالات کے متعلق سوچنے کے لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنی پروگریمنگ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکیں۔مگر شعوری ناپختگی کی بنا پر وہ ایسا نہ کرسکے۔ اِس لیے آخر وقت تک وہ موت کی حقیقت سے بے خبر رہے۔

قرآن میں پیغمبر کے مشن کو اِنذار کا مشن بتایا گیا ہے، یعنی لوگوں کی بے خبری کو توڑنا اور انھیں حقیقتِ حال سے باخبر کرنا۔ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں دیکھیے تو انذار سے مراد یہی معاملہ ہے۔ انسان کے جنیٹک کوڈ میں چوں کہ موت (death) کا اندراج نہیں۔موت ہر انسان پر براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آتی ہے۔ اِس لیے کوئی آدمی اِس معاملے کو اُسی وقت سمجھ سکتا ہے، جب کہ وہ برتر سوچ کی صلاحیت کا ثبوت دے۔ پیغمبر کا مشن یہی ہے کہ ہر عورت اور مرد کے اندر وہ اِس برتر سوچ کی صلاحیت پیدا کرے۔تاکہ ہر انسان موت سے پہلے موت کی حقیقت کو جان لے۔ وہ موت سے پہلے وہ ضروری تیاری کرے، جو اُس کو موت کے بعد کی زندگی میں کامیاب بنانے والی ہو۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ لوگ بار بار موت کے واقعات کو دیکھتے ہیں، لیکن موت کے معاملے پر وہ زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موت اُنھیں صرف خاتمۂ حیات کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس سے بے خبر رہتے ہیں کہ موت ایک نئے زیادہ بامعنیٰ دورِ حیات کا آغاز ہے۔ اگر وہ اِس حقیقت کو جان لیں تو ان کی زندگی کا پورا نقشہ بدل جائے۔ ان کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ومحور یہ بن جائے کہ وہ اپنی موت کے بعد کی زندگی کو زیادہ کامیاب بناسکیں۔

اِس اعتبار سے دیکھیے تو موت زندگی کی مثبت سرگرمیوں کے لیے سب سے زیادہ طاقت ور محرک (incentive) بن جائے گی۔موت کی یاد آدمی کو بے عمل (inactive) نہیں بناتی، موت کی یاد آدمی کو زیادہ سرگرم (active) بنا دیتی ہے۔ موت آدمی کے اندر یہ سوچ پیدا کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عمل کرو، کیوں کہ موت کے بعد عمل کا موقع باقی نہیں رہے گا۔ موت زندگی کا خاتمہ

نہیں، بلکہ موت مواقعِ عمل کا خاتمہ ہے۔ اِس اعتبار سے موت کا رول محرکِ عمل کا رول ہے، نہ کہ مانعِ عمل کا رول۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اس کو ابدی صلاحیت والا دماغ دیا۔ اس کے دماغ کی پلاننگ ہر اعتبار سے ابدیت کی بنیاد پر کی گئی۔ اِس اعتبار سے انسان کی اصل قیام گاہ جنت کی ابدی دنیا ہے۔ لیکن پیدائش کے بعد انسان کو ایک محدود مدت کے لیے موجودہ دنیا میں رکھا جاتا ہے۔ دنیا کا یہ عارضی قیام اس کے ٹسٹ کے لیے ہے۔ موجودہ دنیا کی عارضی مدت میں یہ دیکھا جارہا ہے کہ کون شخص اس ٹسٹ میں پورا اترتا ہے اور کون شخص اس میں پورا نہیں اترتا۔ جو عورت یا مرد اس ٹسٹ میں پورے اتریں گے، ان کو منتخب کر کے جنت میں بسا دیا جائے گا۔ اور جو عورت یا مرد اس ٹسٹ میں پورے نہ اتریں، ان کو قابلِ رد (rejected lot) قرار دے کر الگ کر دیا جائے گا۔

موت دراصل ایک ابدی سفر کا صرف ایک درمیانی اسٹیشن ہے۔ موت انسان کے ابدی تسلسل کا درمیانی انقطاع نہیں، بلکہ وہ خود تسلسلِ حیات کا ایک لحاتی حصہ ہے — موت کا کوئی وقت نہیں، اور نہ موت کی کوئی مدت ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی موت کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ موت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ ہماری اپنی پروگریمنگ کا حصہ نہیں، وہ براہِ راست خدا کی طرف سے آنے والا ایک فیصلہ ہے۔ خدا نے موت کے وقت کی خبر کسی انسان کو نہیں دی، نہ براہِ راست طور پر اور نہ بالواسطہ طور پر۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا اور نہ وہ اس کا کوئی شعور رکھتا۔ آدمی جیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اچانک مر جاتا ہے۔ فطرت کی پروگریمنگ کے مطابق، ہر انسان بطور واقعہ ابدی بن گیا ہے۔ انسان کی اس ابدیت کو کوئی توڑنے والا نہیں۔ البتہ خدا جب دیکھتا ہے کہ آدمی کے ٹسٹ کی مدت پوری ہوگئی، تو وہ خود اپنے فیصلے کے تحت اِس عمل میں مداخلت کرتا ہے۔ وہ انسان کو موجودہ دنیا سے نکال کر بعد کی ابدی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

اِسی وقفۂ انتقال (transfering period) کا نام موت ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے موت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے (transportation) کا معاملہ ہے، نہ کہ زندگی کے خاتمے کا معاملہ۔

یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ زندگی میں کامیابی کے لیے ہر عورت اور مرد کو اپنے اندر ایک خصوصی صلاحیت پیدا کرنا ہے، یہ ہے اینٹی پروگریمنگ سوچ۔ یہ گویا کہ خود اپنے خلاف سوچنے کا معاملہ ہے۔ جو لوگ اس انقلابی طرزِ فکر میں کامیاب ہوں، وہی اس معاملے کو سمجھیں گے، وہی ایسا کرسکیں گے کہ اپنی پروگریمنگ کے خلاف سوچ کر موت کے معاملے کو جانیں اور قبل از موت مرحلۂ حیات میں، بعد از موت مرحلۂ حیات کی تیّاری کریں۔

فرانس کے صدر نکولس سارکوزی (Nicholas Sarkozy) جنوری 2008 میں انڈیا آئے۔ 26 جنوری کو یومِ جمہوریہ کی تقریب میں وہ خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس کے بعد اپنے دورۂ ہند کے آخری مرحلے میں وہ دہلی سے آگرہ گئے، تاکہ وہاں مشہور تاریخی عمارت تاج محل کو دیکھ سکیں۔ ان کے سفر آگرہ کی جو رپورٹ اخبار میں آئی ہے، اس میں ایک سبق آموز جُزء شامل ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صدر فرانس جب تاج محل کو دیکھ چکے تو ان کے سامنے حسب معمول گسٹ بک (Guest Book) لائی گئی تاکہ وہ اس پر اپنا تاثر درج کرسکیں۔ صدر فرانس نے اختصار کے ساتھ اس میں ایک لفظ لکھا۔ یہ فرانسیسی زبان میں اُرووا غ (Uruvor) تھا۔ اس فرانسیسی لفظ کا مطلب ہے: جلد ہی پھر ملیں گے (See you soon, again)۔

میں نے یہ رپورٹ پڑھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ صرف ایک شخص کے ذاتی احساس کی بات نہیں۔ یہ لفظ پوری انسانیت کی نمائندگی کررہا ہے۔ تاج محل کو اگر جنت کا نمائندہ سمجھا جائے تو یہ جملہ پوری انسانیت کے احساس کو بتا رہا ہے۔ اِس دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسان اپنے داخلی احساس کے تحت اپنے دماغ میں ایک جنتی دنیا کا خواب لئے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی کی یہ کوشش ہوتی

ہے کہ وہ خوابوں کی اِس دنیا کی تعمیر کر سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسان کو پیدا کرنے کے بعد خدا نے اس کو جنت میں رکھا۔ اس وقت یہ جنت اس کو صرف عارضی مشاہدے کے لیے دی گئی تھی۔ اس عارضی مشاہدے کے بعد انسان کو موجودہ دنیا میں بسا دیا گیا اور یہ اصول مقرر کیا گیا کہ ہر انسان کی زندگی کا ریکارڈ دیکھا جائے گا اور آخر میں انتخابی بنیاد (selective basis) پر اس کے لیے جنت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اِس خدائی منصوبے کے تحت، انسان موجودہ دنیا میں آباد کیا گیا ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ فطرت کی پروگریمنگ کے تحت، انسان ابدی احساس میں جی رہا ہے، اس کی پروگریمنگ کے اندر موت کا تصور شامل نہیں۔ لیکن آزمائشی پیریڈ کے اعتبار سے اس کو موت کا تجربہ کرنا پڑتا ہے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے شعور کو حرکت میں لا کر اپنے اندر ایک خصوصی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ صلاحیت اینٹی پروگریمنگ سوچ کی صلاحیت ہے۔ ہر ایک کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی پروگریمنگ سے باہر آ کر اپنے معاملے کو جانے۔ وہ پروگریمنگ میں شامل نہ ہونے کے باوجود موت کے معاملے کو دریافت کرے۔ اس دریافت کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہر آدمی اپنی زندگی کی صحیح منصوبہ بندی کرے اور ابدی کامیابی کا مستحق ٹھہرے۔

موجودہ پروگریمنگ کے زیر اثر آدمی یہ کر رہا ہے کہ وہ اِسی موجودہ دنیا میں اپنے لئے جنت کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ یہ گویا کہ سفر کو منزل سمجھ لینا ہے، اور ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی جو بھی تعمیر کرے گا اچانک موت اُس کا خاتمہ کر دے گی۔ آدمی سب کچھ موجودہ دنیا میں چھوڑ کر اگلی دنیا کی طرف بالکل خالی ہاتھ چلا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا ہر انسان کے لیے ایک سفر کا معاملہ ہے۔ آپ ٹرین سے سفر کریں یا ہوائی جہاز سے، آپ اپنے کو مسافر سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ سکون کے ساتھ اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ اگر آپ سفر کو منزل سمجھ لیں اور سفر کے دوران وہ تمام سہولتیں حاصل کرنا چاہیں جو صرف

حالتِ قیام میں حاصل ہوتی ہیں، تو آپ کا سفر سخت تکلیف کا سفر بن جائے گا، خواہ آپ ٹرین یا ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں۔

یہی اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کا معاملہ ہے۔ جو عورت اور مرد اِس حقیقت کو سمجھ لیں، وہ آخر کار کامیاب زندگی کے مستحق قرار پائیں گے۔ اور جو لوگ اِس حقیقت کو نہ سمجھیں وہ صرف یہ کریں گے کہ فطرت کی طرف سے ملا ہوا قیمتی موقع کھو دیں، جب کہ یہ موقع دوبارہ کسی کو ملنے والا نہیں۔ موت اِس حقیقت کا اعلان ہے کہ موجودہ زندگی میں انسان کو جو مختلف چیزیں ملی ہوئی تھیں، وہ بطور استحقاق نہ تھیں، بلکہ وہ صرف پرچہ ہائے امتحان (test papers) کے طور پر تھیں۔ موت کا آنا امتحان کے وقت کا ختم ہو جانا تھا۔ مدتِ امتحان کے ختم ہوتے ہی وہ تمام چیزیں بھی انسان سے چھن گئیں جو اس کو بطور امتحان ملی تھیں۔

اِس طرح موت ہر انسان کو یہ بتاتی ہے کہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں تم بالکل اکیلے ہو جاؤ گے۔ اُن تمام چیزوں میں سے کوئی بھی چیز تمھارا ساتھ نہ دے گی، جو موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں تم کو حاصل تھی۔ یہ صورتِ حال بے حد سنگین ہے۔ یہ صورتِ حال آدمی کو متنبہ کر رہی ہے کہ تم موت کے بعد کے مرحلۂ حیات کے لیے تیاری کرو۔ اگر تم ضروری تیاری کے بغیر موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں داخل ہو گئے، تو اچانک تم اپنے آپ کو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں پاؤ گے۔ تم اچانک دیکھو گے کہ موجودہ زندگی میں جو کچھ تم کو حاصل تھا، وہ سب تمھارا ساتھ چھوڑ چکا، اور اب نئے مرحلۂ حیات میں جینے کے لیے جو کچھ درکار ہے، وہ سرے سے تم کو حاصل ہی نہیں۔

آخرت میں صرف اس شخص کو
خدا کا دیدار حاصل ہوگا جس نے دنیا میں
خدا کو دیکھنے کی نگاہ پیدا کی ہو

لائف بیانڈ لائف

Life Beyond Life

کیاموت کے بعد آدمی دوبارہ زندہ رہتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہاں۔ موجودہ دنیا میں کسی بھی چیز کوثابت کرنے کے لیے جس طرزِ استدلال کومعتبر سمجھا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرزِ استدلال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت کسی کے لیے زندگی کا خاتمہ نہیں۔ ہر عورت اور مرد کی زندگی ابدی ہے۔ موت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی ایک دورِ حیات سے نکل کر دوسرے دورِ حیات میں داخل ہوجاتا ہے۔

1۔ علماء طبّ پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ موت کا مطلب دل کی حرکت کا بند ہوجانا ہے۔ مگر اب یہ نظریہ رد کیا جاچکا ہے۔ اب یہ مانا جاتا ہے کہ کوئی آدمی اُس وقت مرتا ہے جب کہ اس کے برین کا فنکشن رُک جائے۔ اس واقعہ کو بتانے کے لیے فنکشن کا لفظ درست نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ برین کسی انسان کے لیے موجودہ دنیا میں اس کے سفر کا آخری اسٹیشن ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، جب انسان کے ساتھ وہ واقعہ پیش آتا ہے جس کو کلنکل موت (clinical death) کہا جاتا ہے تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل جاتی ہے، لیکن جہاں تک برین کا تعلق ہے، وہ بدستور ویسا ہی باقی رہتا ہے جیسا کہ وہ موت سے پہلے تھا۔ موت کے بعد برین کا ایک سیل (cell) بھی کم نہیں ہوتا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ روح یا انسان کی شخصیت (personality) برین سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے برین کا حصہ نہیں۔

2۔ اس سلسلے میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مرنے والا انسان مرکر بظاہر ہمارے پاس سے چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے وجود کا کم از کم ایک حصہ دنیا میں باقی رہتا ہے۔ یہ اس شخص کی آواز ہے۔ اس کے مرنے کے بعد جب ہم کیسیٹ پر اس کی آواز سنتے ہیں تو ہم کسی شبہہ کے بغیر یہ جان

لیتے ہیں کہ یہ آواز اُسی مرنے والے انسان کی آواز ہے۔

موت کے بعد کسی آدمی کی آواز کا ٹھیک اُسی طرح موجود رہنا، اِس بات کا کم از کم ایک جزئی ثبوت ہے کہ انسان کی ہستی ایک غیر فانی ہستی ہے۔ انسان کی شخصیت کا اگر ایک جز ثابت شدہ طور پر موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے تو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی پوری ہستی بھی قابلِ اعادہ (repeatable) حالت میں باقی اور موجود ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت کے بعد کسی انسان کی آواز جو باقی رہتی ہے وہ صوتی لہروں (sound waves) کی شکل میں باقی رہتی ہے۔ جب کہ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لیے کہ اس دنیا میں ہر چیز لہروں ہی کا ایک مجموعہ ہے۔ اس دنیا میں جو چیزیں ہیں ان کی آخری ہیئت لہروں پر مشتمل ہے۔ میٹریل ورلڈ کی ہر چیز اپنے آخری تجزیے میں الکٹران ہے، اور الکٹران کے بارے میں سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اَمواج امکان (waves of probability) ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ پھر اگر اِس دنیا کی تمام چیزیں امواجِ امکان ہیں تو انسان کی شخصیت بھی اگر امواجِ امکان کی ایک صورت ہو تو اس کے وجود سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

3۔ حیاتیاتی سائنس بتاتی ہے کہ انسان کا وجود بے شمار چھوٹے چھوٹے سیل (cell) کا مجموعہ ہے۔ یہ سیل ہر وقت ٹوٹتے رہتے ہیں، اور نیا سیل پرانے سیل کی جگہ لیتا رہتا ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پورے جسم کے تمام سیل بدل جاتے ہیں۔ گویا کہ معروف موت سے پہلے بھی انسان کا جسم برابر مرتا رہتا ہے۔

جسم میں سیل کے بدلنے (replacement) کا یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کا سابقہ جسم مکمل طور پر مر جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی کا حافظہ (memory) مستقل طور پر ایک حالت میں باقی رہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب جسم پر بار بار موت واقع ہوتی ہے تو انسان کا حافظہ کہاں باقی رہتا

ہے۔ اگر وہ جسم کے سیل پر موجود رہا ہو تو حافظے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن سیل کے فنا ہونے کے باوجود حافظے کا باقی رہنا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی شخصیت، جسم سے ماورا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ معروف موت کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھتی ہے۔

4۔ اس سلسلے میں آخری اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے جو طرزِ استدلال رائج ہے، اور جس معیار پر وضاحت کے بعد چیزیں ثابت شدہ مان لی جاتی ہیں، اسی معیار پر زندگی بعد موت کے ثبوت کا تقاضا بھی کیا جا سکتا ہے۔ کسی اور معیار پر زندگی بعد موت کے ثبوت کا تقاضا کرنا غیر علمی بات ہے۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی بعد موت بھی اسی طرح ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جس طرح زندگی قبل موت ایک ثابت شدہ واقعہ سمجھی جاتی ہے۔ خالص منطقی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

دستک

آخرت میں خدا کی جنت کے دروازے ان لوگوں کے لیے کھولے جائیں گے جو دنیا میں اپنے دل کے دروازے خدا کی نصیحت کے لیے کھولیں۔

جنت اور جہنم کا فیصلہ در اصل دل کی دنیا میں ہوتا ہے۔ خدا اپنے کسی بندے کے ذریعہ آدمی کے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ کسی بندۂ خاص کے ذریعہ اس کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ یہ لمحہ کسی انسان کی زندگی میں نازک ترین لمحہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت اپنے دل کے دروازے کھول دے تو گویا کہ اس نے اپنے لیے جنت کا دروازہ کھول لیا۔ اگر وہ اس وقت اپنے دل کے دروازے بند رکھے تو گویا اس نے اپنے اوپر جنت کے دروازے کو بند کر لیا۔

اس دنیا میں حق کا قبول کرنا یا حق کا انکار کرنا ہی وہ خاص لمحہ ہے جب کہ آدمی کے لیے ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔

دیوارِ قہقہہ

The story of the wall of laughter

ایک پُرانا قصہ ہے کہ کسی مقام پر ایک مضبوط دیوار تھی۔ یہ دیوار بہت اونچی تھی۔ اِسی کے ساتھ وہ دونوں طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اُدھر رہتے ہیں۔ دیوار کے ایس طرف جو لوگ رہتے تھے، انھوں نے یہ چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اِس مقصد کے لیے انھوں نے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی، پھر انھوں نے اُس سیڑھی کو دیوار کے ایک طرف کھڑا کیا اور اپنے ایک آدمی کو سیڑھی پر چڑھایا، تاکہ وہ دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں سے دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ اِس مشاہدے کے بعد وہ نیچے آکر دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو دیوار کے دوسری طرف کا حال بتائے۔ لیکن جب یہ آدمی لمبی سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر پہنچا تو دوسری طرف کی دنیا اُس کو اتنی زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔

اِس کے بعد دیوار کے اِس طرف رہنے والوں نے اپنے ایک اور آدمی کو تیار کیا اور اس کو لمبی سیڑھی کے اوپر چڑھایا، لیکن دوبارہ یہی ہوا کہ جب وہ آدمی دیوار کے اوپر پہنچا تو قہقہہ لگا کر وہ دوسری طرف کود پڑا۔ یہ تجربہ بار بار کیا جاتا رہا، لیکن ہر بار یہی ہوا کہ اوپر چڑھنے والے آدمی کو دوسری طرف کا منظر اتنا پُرکشش نظر آیا کہ وہ قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔ اِس طرح دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کے لیے دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور نامعلوم بنا رہا۔

اِس افسانوی دیوار کو اگر موت کی دیوار مانا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ دیوار کے اِس طرف ہے، اور اس کا دوسرا حصہ دیوار کے دوسری طرف۔ دیوار کے دوسری طرف خوشیوں کی دنیا، یا دوسرے لفظوں میں، جنت کی دنیا بسی ہوئی ہے اور دیوار کے اِس طرف محنت اور مشقت کی دنیا ہے، تو یہ کہانی انسانی تاریخ کے اوپر مکمل طور پر صادق آئے گی۔ یہ تمثیلی کہانی گویا

کہ پوری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔

انسان پیدائشی طور پر اپنے لیے خوشیوں کی ایک زندگی چاہتا ہے۔ اِس اعتبار سے انسان کو متلاشیٔ مسرت حیوان (joy-seeking animal) کہا جاسکتا ہے۔ قدیم انسان نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی زندگی مختلف قسم کے غم سے بھری ہوئی ہے، تو اس نے اپنے لیے ایک پُرمسرت زندگی کی تلاش شروع کردی۔ اِس تلاش کا غالباً پہلا نمایاں واقعہ پہیہ (wheel) کی دریافت تھی۔ پہیے کی دریافت کے بعد تلاشِ مسرت کا یہ انسانی سفر شروع ہوگیا۔ اِس سفر کو ایک متعین نام دینا ہو تو اُس کو تہذیب کا سفر کہا جاسکتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر چلتا رہا۔ لمبی مدت کے بعد آخر کار یہ سفر جدید تہذیب (modern civilization) کے دَور تک پہنچ گیا۔ اب اُس کو تیز رفتار سفر کے لیے مشین کی طاقت حاصل ہوگئی۔ جدید کمیونی کیشن کا زمانہ آیا اور جسمانی سفر کے بغیر انسان کی آواز اور اس کی متحرک تصویر بعید ترین مسافت تک پہنچنے لگی۔ جدید انڈسٹری نے کنزیومرازم (consumerism) کا دور پیدا کیا، جب کہ راحت اور آسائش کی تمام چیزیں غلّے اور سبزی کی طرح بازار میں بکنے لگیں، وغیرہ۔

اِس طرح انسانی تہذیب کامیابی کے ساتھ لمبا سفر طے کرتے ہوئے آخر کار اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ گئی، لیکن اِس آخری منزل پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک نیا شدید تر مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب یہ ہوا کہ دیوارِ قہقہہ (laughter wall) اُن کے لیے ایک نئی قسم کی دیوارِ گریہ (wailing wall) بن گئی۔ اب معلوم ہوا کہ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد جو دنیا اپنے لیے بنائی تھی، وہ انسان کے لیے خوشیوں کی دنیا نہ تھی، بلکہ وہ صرف نئی ناقابلِ عبور مصیبتوں کی ایک دنیا تھی۔ چناں چہ اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب ایک بند گلی (blind alley) تک پہنچ کر انسانی تاریخ کے خاتمہ (end of history) کے ہم معنیٰ بن گئی۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک ہے، وہ یہ کہ خوشیوں کی ایک دنیا بنانے کے لیے ایک مکمل انڈسٹری درکار ہے۔ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد ایک ایسی انڈسٹری تیار کی، لیکن جب یہ انڈسٹری تیار ہوگئی تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ انڈسٹری ایک نیا ناقابلِ عبور مسئلہ

لے کر آئی ہے۔ یہ مسئلہ فضائی کثافت (air pollution) کا مسئلہ ہے، جو کہ انسانی انڈسٹری کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے۔ ہم کو اپنی مطلوب راحتوں کی دنیا بنانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution-free industry) درکار ہے، اور بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اِس طرح کثافت کے مسئلے نے عملی طور پر تہذیب کے تمام ثمرات (achievements) کی نفی کردی ہے۔

ایک طرف، اپنی مطلوب دنیا بنانے کے لیے انسان کے عجز کا یہ معاملہ ہے اور دوسری طرف، اِسی دنیا میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ایک بے کثافت انڈسٹری عملاً ہزاروں سال سے مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ فطرت (nature) کی انڈسٹری ہے۔ تہذیب، بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانے میں مکمل طور پر ناکام رہی، لیکن اِسی دنیا میں فطرت (nature) ایک مکمل قسم کی بے کثافت انڈسٹری بہت بڑے پیمانے پر بالفعل (in action) قائم کیے ہوئے ہے۔

موجودہ سیارۂ زمین جس پر انسان رہتا ہے، وہ مسلسل طور پر گردش میں ہے۔ وہ اپنے محور (axis) پر ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔ اِسی کے ساتھ وسیع خلا میں سورج کے گرد وہ اپنے مدار (orbit) پر 19 کروڑ میل کا لمبا سفر طے کرتا ہے، پہلا سفر 24 گھنٹے میں پورا ہوتا ہے اور دوسرا سفر ایک سال میں۔ سیارۂ زمین کا یہ دوطرفہ تیز رفتار سفر مسلسل طور پر جاری ہے، لیکن یہاں نہ کوئی شور (noise) ہے اور نہ کسی قسم کی کثافت (pollution)۔

سورج آگ اور انرجی کا بہت بڑا بھنڈار ہے۔ وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اُس سے 12 لاکھ زمینیں بن سکتی ہیں۔ وہ زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل دور رہتے ہوئے مسلسل طور پر ہم کو روشنی اور حرارت بھیج رہا ہے، لیکن دوبارہ یہاں کسی قسم کی کوئی کثافت (pollution) مطلق موجود نہیں۔ اِسی طرح نیچر میں ایک اور انڈسٹری ہے۔ یہ درختوں اور پودوں کی صورت میں قائم ہے۔ یہ انڈسٹری ایک نہایت پیچیدہ نظام کے تحت، انسان کو مسلسل طور پر صحت بخش آکسیجن سپلائی کررہی ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ ہماری سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کررہی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم انڈسٹری

ہے،لیکن یہ انڈسٹری بھی شور اور کثافت جیسی نامطلوب چیزوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔

اِسی طرح پانی کو دیکھیے۔ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ بڑے بڑے سمندروں کی صورت میں ہماری زمین پر موجود ہے۔ اِس ذخیرے میں تحفّظاتی مادّہ (preservative) کے طور پر تقریباً 10 فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ اِس بنا پر وہ براہِ راست طور پر انسان کے لیے قابلِ استعمال نہیں۔ یہاں بارش کی صورت میں ایک عظیم آفاقی عمل جاری ہے، جس کو ازالۂ نمک (desalination) کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ناقابلِ بیان حدتک ایک عظیم انڈسٹری ہے،لیکن یہ انڈسٹری کسی قسم کی کوئی کثافت پیدا نہیں کرتی۔

یہی معاملہ انسانی خوراک کا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوراک غلّہ اور سبزی اور پھل اور دودھ اور مچھلی اور گوشت، وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام خوراک بھی مسلسل طور پر انسان کے لیے وجود میں لائی جارہی ہے۔ یہ عمل بھی ایک عظیم انڈسٹری کے ذریعے انجام پاتا ہے،لیکن یہاں بھی انسانی صنعتوں کی مانند کوئی کثافت پیدا نہیں ہوتی۔

یہ دومختلف قسم کے تجربے ہیں۔ ایک، انسانی تہذیب کی انڈسٹری اور دوسرے، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری۔ انسانی تہذیب کی انڈسٹری ہمارے لیے خوشیوں اور راحتوں کی دنیا بنانے میں ناکام ہے۔ وہ راحت کے سامان وجود میں لانے کی کوشش میں مصیبتوں کا ایک نیا جنگل اُگا دیتی ہے۔ دوسری طرف، عین اُسی وقت، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری راحت کے تمام سامان پیدا کررہی ہے،لیکن وہ مکمل طور پر ایک بے کثافت انڈسٹری ہے، نہ کہ انسانی انڈسٹری کی طرح پُر کثافت انڈسٹری۔

اب اگر قدیم کہانی کے مطابق، دیوار کو موت کی دیوار قرار دیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دیوار کے ایک طرف دنیائے گریہ (wailing world) ہے، اور اِس دیوار کے دوسری طرف دنیائے قہقہہ (laughter world) ہے۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر تہذیبِ انسانی کی ناکامی ہمیں ایک نیا پُرامید سبق دے رہی ہے، وہ یہ کہ ہم ''دیوار'' کے اِس طرف ناکام طور پر اپنی دنیائے قہقہہ بنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ''دیوار'' کے دوسری طرف کی ''دنیائے قہقہہ'' میں اپنی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں، جو کہ بَروقت ہی ڈوائن نظام کے تحت ''دیوار'' کے دوسری طرف موجود ہے۔

بریک اِن ہسٹری
Break in History

گورنمنٹ سروس کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم بغیر رخصت (without an approved leave) دفتر میں حاضر نہ ہو، تو گورنمنٹ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اس کو شکستِ ملازمت (break in service) کا کیس قرار دے دے۔ شکستِ ملازمت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سینیر ٹی (seniority) ختم ہوجائے گی۔ وہ حقوق ملازمت کے اعتبار سے واپس ہو کر اپنے پہلے دن کے حال پر پہنچ جائے گا، جب کہ اس کا تقرّر ہوا تھا، اس کے لیے ملازمت کے پچھلے ایام کے اعتبار سے (promotion) کا حق باقی نہ رہے گا:

A break in service is any separation from employment status.

یہ اصول زیادہ بڑے پیمانے پر ہر عورت اور مرد پر منطبق ہوتا ہے۔ اِس دوسرے عمومی اصول کو شکستِ تاریخ (break in history) کہا جا سکتا ہے، یعنی تاریخ کا ختم ہوجانا۔ کسی آدمی نے اپنے عمل سے اپنی جو تاریخ بنائی ہے، اس کا اچانک مٹ جانا اور انسان کا اپنے بے تاریخ دَور کی طرف لوٹ جانا۔

اِس دنیا میں ہر آدمی اپنی بنائی ہوئی تاریخ کی بنا پر کھڑا ہوتا ہے۔ ایک انسان یہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے بڑا ہوتا ہے۔ اس کو مختلف قسم کے مواقع ملتے ہیں، جن کو استعمال کر کے وہ اپنی ایک تاریخ بناتا ہے۔ گھر اور جائداد اور خاندان اور حلقہ اور شہرت اور اقتدار اور مال اور اسباب، وغیرہ۔ اِس قسم کی چیزیں اس کے گِرد اکٹھا ہوجاتی ہیں۔

اِس طرح اس کی اپنی بنائی ہوئی ایک تاریخ ہوتی ہے جس کے ذریعے اس کا تشخّص قائم ہوتا ہے، اس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو جانتا ہے اور اس کے ذریعے دوسرے لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ یہ معاملہ ہر عورت اور مرد کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر ایک مسلسل جدوجہد کے ذریعے اپنی ایک

تاریخ بناتا ہے جس کے اوپر وہ کھڑا ہوتا ہے۔

لیکن کوئی بھی شخص لمبی مدت تک اپنی تاریخ میں جینے کا موقع نہیں پاتا۔ سو سال کے اندر ہی اچانک وہ لمحہ آجاتا ہے جس کو موت کہتے ہیں۔ موت ایک ناقابلِ واپسی فیصلے کے طور پر ہر شخص کے اوپر آتی ہے اور اچانک قبل از موت مرحلۂ حیات سے جدا کر کے اُس کو بعد از موت مرحلۂ حیات میں پہنچا دیتی ہے۔

موت کو اِس اعتبار سے شکستِ تاریخ (break in history) کا معاملہ کہا جاسکتا ہے۔ شکستِ تاریخ کا یہ واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ معاملہ ہے کہ وہ اپنی ساری طاقت خرچ کر کے اپنی امیدوں اور اپنی تمناؤں کی ایک دنیا بناتے ہیں۔ ہر انسان اپنی بنائی ہوئی اِس دنیا میں جی رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے لیے موت کا وقت آجاتا ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِس بنائی ہوی دنیا کو چھوڑ کر اچانک ایک اور دنیا میں پہنچ جائے، جس کے لیے اُس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اُس کے پیچھے اس کی بنائی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا، اور اس کے آگے ایک ابدی صحرا ہوتا ہے جس کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔ یافت کے احساس میں جینے والا انسان اچانک کامل محرومی کے دور میں داخل ہو جاتا ہے۔

قبل از موت کا مرحلۂ حیات ہر انسان کے لیے پہلا اور آخری موقع ہے، اس کے بعد کسی کو دوسرا موقع ملنے والا نہیں۔ اِس پہلے موقع کو جس شخص نے صرف دُنیوی ساز وسامان کی فراہمی میں لگایا، وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں کامل محرومی میں جینے پر مجبور ہوگا۔ کیوں کہ موت اس کی پچھلی تاریخ کو اُس سے جدا کر دے گی، اور موت کے بعد دوبارہ نئی تاریخ بنانے کا موقع اُس سے ہمیشہ کے لیے چھن چکا ہوگا۔ کیسا عجیب ہے آج کا وہ موقع جس کو انسان کھو رہا ہے، اور کیسی بھیانک ہوگی کل کی وہ محرومی جس سے انسان دوچار ہوگا، اور جس سے اپنے آپ کو بچانا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

انسان کی منزل

انسان اپنے لیے ایک محفوظ دنیا چاہتا ہے، مگر سنامی (دسمبر 2004) کا واقعہ بتاتا ہے کہ انسان کو صرف ایک غیر محفوظ دنیا ملی ہے۔ انسان لامحدود زندگی چاہتا ہے، مگر موت کا واقعہ اس کو یاد دلاتا ہے کہ اس کو یہاں جینے کے لیے ایک محدود مدت ملی ہے۔ انسان آئڈیل خوشی چاہتا ہے، مگر مختلف قسم کے حادثات یہ بتاتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں صرف ایسی خوشی مل سکتی ہے جو اس کے مطلوب آئڈیل سے بہت کم ہے۔ انسان استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے، مگر اس کو عملاً آج (today) کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر اتھاہ پوٹینشیل موجود ہے، مگر ہر انسان اپنے پوٹینشیل کا ایک فیصد استعمال کرتا ہے اور اس کے بعد اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب خود انسان کی فطری ساخت کے اندر موجود ہے۔ استثنائی طور پر انسان کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ تمام حیوانات صرف آج (today) کے تصور میں جیتے ہیں۔ کرۂ ارض پر انسان واحد ایسی مخلوق ہے جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہے۔ یہی فطرت کی طرف سے مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے آج میں ڈھونڈ رہا ہے وہ اس کے کل میں موجود ہے۔ وہ اپنے جس مطلوب کو پرزنٹ میں پانا چاہتا ہے وہ خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، اس کے مستقبل میں رکھ دیا گیا ہے۔

خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کی عمر کے دو حصے ہیں۔ ایک ماقبل موت دَور (pre-death period) اور دوسرا مابعد موت دَور (post-death period)۔ انسان کی مطلوب دنیا (desired world) اس کے مابعد موت دَور (post-death period) میں رکھی گئی ہے۔ ماقبل موت دَور کی حیثیت امتحان گاہ (selective ground) کی ہے۔ جو عورت یا مرد ماقبل موت دَور میں خود کو اہل (qualify) ثابت کریں گے، وہ مابعد موت دَور میں اپنی مطلوب دنیا (desired world) میں بسائے جانے کے مستحق قرار پائیں گے۔ اسی مطلوب دنیا کا نام جنت ہے۔

سنامی جیسے واقعات ایک وارننگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی وارننگ کہ موجودہ دنیا

میں انسان اپنی جنت نہیں بنا سکتا۔ ہماری زمین اگرچہ بہت خوب صورت ہے، مگر وہ اتنا زیادہ پُرخطر (vulnerable) ہے اور یہاں اتنی محدودیتیں (limitations) ہیں کہ وہ جنت کا مسکن (abode) نہیں بن سکتی۔ ہماری زمین جنت کا ایک ابتدائی تعارف ہے مگر وہ خود جنت نہیں۔ جنت کی تعمیر کے لیے ہم کو ایک اور دنیا چاہیے، ایک ایسی دنیا جو کہ لامحدود (unlimited) ہو۔ جو ہر قسم کے خوف سے پاک ہو۔ جنت ایک کامل (perfect) دنیا چاہتی ہے، جب کہ موجودہ دنیا ہر اعتبار غیر کامل (imperfect) ہے۔ اور غیر کامل زمین پر کامل جنت نہیں بنائی جا سکتی۔

انسان اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے جنت کا طالب ہے، مگر انسان کے اندر استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور (concept) بتاتا ہے کہ جنت ورلڈ ٹو مارو (world-tomorrow) میں قابل حصول ہے، ورلڈ ٹوڈے (world-today) میں وہ قابل حصول نہیں۔ اس حقیقت کو جاننا بلاشبہ سب سے بڑا وزڈم (wisdom) ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان کر ''کل'' پر مبنی لائف بنا سکیں وہ کامیاب ہیں اور جو لوگ اپنی زندگی صرف 'آج' پر مبنی کر کے بنائیں، وہ ناکام ہیں۔

کل کا سورج

کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے اپنے لڑکے شہزادہ سلیم کی شادی میں اس کو چار سو ہاتھی کا تحفہ دیا تھا۔ یہ چار سو ہاتھی دوہد (گجرات) کے گھنے جنگلوں سے حاصل کیے گیے تھے۔ مگر آج گجرات کے اس علاقہ نہ کہیں گھنے جنگل نظر آتے ہیں، اور نہ ہاتھی۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ کس طرح بدلتا رہتا ہے۔ ایک جگہ جہاں آج ''جنگل'' نظر آتا ہے، وہاں کل ''میدان'' نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں آج ہاتھیوں کے غول گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہاں جب کل کا سورج نکلتا ہے تو دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہاں انسان چل پھر رہے ہیں۔

زمانہ کے اس بدلتے ہوئے روپ میں بے شمار نشانیاں ہیں۔ مگر نشانیوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو ان کی گہرائیوں میں جھانکنے کی بصیرت رکھتے ہوں۔

ایک دورِ حیات کا خاتمہ

جون 2007 کے پہلے ہفتے میں جرمن (برلن) میں جی آٹھ (G-8) کی ایک کانفرنس ہوئی۔ ترقی یافتہ ملکوں کے سربراہ اُس میں شریک ہوئے۔ اس کے ایجنڈے میں نمایاں طور پر گلوبل وارمنگ کا مسئلہ تھا۔ لمبی بحث کی باوجود کوئی پروگرام طے نہ ہوسکا۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار (ٹائمس آف انڈیا، 10 جون 2007) میں اِس اہم میٹنگ کی رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے— اتنے زیادہ مفلس کہ وہ دنیا کو بچا نہیں سکتے:

Too broke to save the world

گلوبل وارمنگ کے بارے میں آج کل روزانہ میڈیا میں خبریں آرہی ہیں۔ دنیا بھر کے سائنس داں یہ بتا رہے ہیں کہ دنیا کی کلائمیٹ (climate) خطرناک طور پر بدل رہی ہے۔ 2015 تک، یعنی اب سے صرف آٹھ سال کے اندر زمین پر لائف سپورٹ سسٹم اتنا زیادہ بگڑ چکا ہوگا کہ یہاں زندگی کی بقا اور نشو ونما ممکن نہیں رہے گی۔

یہ سادہ طور پر موسم میں تغیر کی بات نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا نے انسان کو اور انسانی تہذیب کو رد کردیا ہے۔ انسان نے موجودہ زمین پر مزید رہنے کا جواز کھو دیا ہے۔ اب وہ وقت بالکل قریب آ گیا ہے جب کہ خدائی نقشے کے مطابق، پہلا دورِ حیات ختم ہوجائے اور دوسرا دورِ حیات شروع ہو، یعنی عالمِ آخرت کا دورِ حیات۔

خدا نے موجودہ دنیا کو انسان کے لیے تیاری کی دنیا (preparatory ground) کے طور پر بنایا تھا۔ یہاں وہ تمام چیزیں مہیّا کی گئی تھیں جن کے ذریعے آدمی اپنے آپ کو جنت کے قابل بنائے۔ اِس دنیا کی ہر چیز سامانِ تیاری تھی، نہ کہ سامانِ عیش۔ مگر انسان نے خدا کے تخلیقی پلان سے سرتابی کی۔ اُس نے موجودہ دنیا کو اپنے لیے مقامِ عیش سمجھ لیا اور اُس نے زندگی کا یہ فارمولا بنایا:

Eat, drink and be merry.

اس طرح انسان نے خدا کے تخلیقی نقشے کو بدل دیا۔ یہاں تک کہ اس نے موجودہ تہذیب پیدا کی جو آخری معنوں میں اِسی فارمولے پر قائم ہے۔ خدا نے ہزاروں سال تک انتظار کیا کہ انسان اپنی روش پر نظر ثانی کرے۔ وہ خدا کی دنیا میں اپنا ذاتی ایجنڈا چلانا بند کردے۔ وہ اپنی اصلاح کرکے خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ وہ موجودہ دنیا کے مواقع کو اِس مقصد کے لیے استعمال کرے کہ وہ خدا کا وہ مطلوب بندہ بن جائے جس کو خدا اپنی ابدی جنت میں بسانے کے لیے منتخب کرے گا۔

مگر انسان اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں، یہاں تک کہ انسان کے اوپر خدا کی حجت تمام ہوگئی۔ اب انسان نے وہ جواز کھودیا جس کے تحت وہ زمین پر بسا ہوا تھا— موجودہ گلوبل وارمنگ دراصل اِسی حقیقت کا پیشگی انتباہ ہے۔

اِس صورتِ حال میں ہر مذہب کے لوگوں کی یہ ذمّے داری تھی کہ وہ دنیا کو آنے والے بھیانک خطرے سے آگاہ کریں۔ وہ لوگوں کو بتائیں کہ اب تیاری کا آخری موقع ختم ہونے والا ہے۔ کسی تاخیر کے بغیر ہوشیار ہوجاؤ اور خدا کے نقشے کے مطابق، زندگی گزارنا شروع کردو۔

لیکن ہر مذہب کے لوگ، بشمول مسلمان، کسی ''آنے والے'' کا انتظار کررہے ہیں۔ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ کوئی آنے والا پُراسرار طور پر آئے گا اور معجزاتی طاقت کے ذریعے وہ سارے کام کو انجام دے دے گا۔ مگر یہ سخت بھول کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی پُراسرار ہستی آنے والی نہیں۔ جو چیز آنے والی ہے، وہ صرف قیامت ہے۔ اور قیامت جب آئے گی تو وہ کسی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرے گی۔ اُس کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ یکساں ہوگا۔

غیر مومن کے اوپر جو کچھ قیامت میں گزرے گا، وہ مومن کے اوپر اسی دنیا میں گزرجاتا ہے۔

جنت اور انسان

غالباً 1998 کی بات ہے، ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے مجھے دہلی کے ایک سینئر اسکالر سے ملایا۔ یہ پروفیسر نونہال سنگھ (پیدائش: 1923) تھے۔ امریکا سے رٹائر ہو کر آنے کے بعد یہاں ان کو راجیہ سبھا کا ممبر (1998-1992) بنا دیا گیا تھا۔ اُن کا گھر ایک کتب خانہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس میں ہر طرف لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک اسکالر دکھائی دیتے تھے۔

ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ پولٹکل سائنس میں انھوں نے ایم اے کیا تھا۔ اِس کے بعد انھوں نے انٹرنیشنل ریلیشنس (international relations) کے سبجیکٹ پر ڈاکٹریٹ کیا۔ اُس زمانے میں امریکا کی ایک یونی ورسٹی کو اپنے لیے اِس موضوع پر ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ اُس کا اشتہار دیکھ کر پروفیسر سنگھ نے اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ جلد ہی انھیں یونی ورسٹی کی طرف سے ایک لیٹر ملا، اِس میں انھیں انٹرویو کے لیے امریکا بلایا گیا تھا۔

وہ امریکا پہنچے تو ائرپورٹ پر ایک صاحب اُن سے ملے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یونی ورسٹی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، تا کہ یہاں میں آپ کو گائڈ کروں۔ اِس کے بعد اُس آدمی نے پروفیسر سنگھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور اُن کو لے کر یونی ورسٹی پہنچا۔ یونی ورسٹی میں پروفیسر سنگھ کو وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا۔

اِس کے بعد وہ آدمی روزانہ پروفیسر سنگھ کے پاس آتا اور ان کو لے کر صبح سے شام تک یونی ورسٹی کے وسیع کیمپس میں گھماتا رہتا۔ اِس طرح وہ آدمی پروفیسر سنگھ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا اور یونی ورسٹی کی ہر سرگرمی میں انھیں شامل کیا۔ مثلاً لائبریری، ڈائننگ ہال، کلاس روم، ٹیچرس کلب، اسٹوڈنٹس میٹنگ، یونی ورسٹی ورکرس، وغیرہ۔

اِس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ پروفیسر سنگھ کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین سے کہا کہ میں ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اب تک

میرا انٹرویو نہیں ہوا۔ چیئرمین نے کہا کہ آپ کا انٹرویو ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کا سلیکشن کرلیا ہے، اوراب آپ کل سے ہمارے یہاں جوائن کر لیجیے۔ اِس کے بعد چیئرمین نے بتایا کہ ائرپورٹ پر ہمارا جو آدمی آپ سے ملا تھا، وہ یہاں کا سینئر پروفیسر تھا۔ اور وہی آپ کا انٹرویور بھی تھا۔

چیئرمین نے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات کو دیکھنے کے بعد ہم نے جان لیا تھا کہ جہاں تک تعلیمی لیاقت کا تعلق ہے، آپ اس کے پوری طرح اہل ہیں۔ اب ہم کو یہ جاننا تھا کہ آپ ہمارے یونی ورسٹی کلچر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا مذکورہ انٹرویور یہی کام کررہا تھا۔ وہ آپ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا۔ اس نے یہاں کی تمام ایکٹوٹیز (activities) سے آپ کو متعارف کرایا۔ اس نے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرس دونوں کے ساتھ آپ کے سلوک کو دیکھا۔ اِس دوران وہ آپ کی ہر بات کا دقّتِ نظر کے ساتھ معائنہ کرتا رہا۔ انٹرویور کی رپورٹ آپ کے بارے میں پوری طرح مثبت ہے۔ چناں چہ آپ کے ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد ہم نے آپ کا انتخاب کرلیا ہے۔ آپ کل سے یہاں اپنا کام شروع کردیں۔

یہ واقعہ ایک حقیقی مثال کی صورت میں، جنت اور انسان کے معاملے کو بتاتا ہے۔ خدا نے ایک وسیع دنیا بنائی، جنت کی دنیا۔ یہ دنیا پورے معنوں میں ایک کامل دنیا تھی۔ یہاں ہر چیز اعلیٰ معیار کے مطابق تھی۔ خدا نے چاہا کہ اِس کامل دنیا میں وہ ایسے لوگوں کو بسائے جو اپنے کردار کے اعتبار سے اُس کے لیے پوری طرح اہل ہوں، جو اِس معیاری دنیا میں معیاری انسان کی حیثیت سے رہ سکیں۔

اب خدا نے اِس دنیا کے تعارفی نمونے کے طور پر موجودہ زمینی سیّارہ بنایا۔ یہاں وہ ساری چیزیں پائی جاتی ہیں جو جنتی دنیا کے اندر موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنتی دنیا، معیاری دنیا (perfect world) ہے اور موجودہ زمینی دنیا، غیر معیاری دنیا (imperfect world)۔ جنتی دنیا کامل ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر کامل۔ جنتی دنیا ابدی ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر ابدی۔ جنتی دنیا ہر قسم کے خوف اور حُزن سے خالی ہے، جب کہ موجودہ دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ خوف اور حزن سے بھری

ہوئی ہے۔ جنتی دنیا انعام (reward) کی دنیا ہے اور موجودہ دنیا آزمائش (test) کی دنیا۔

اِس منصوبے کے تحت، خدا نے انسان کو پیدا کرکے اس کو موجودہ زمینی دنیا میں بسایا۔ خدا نے انسان کو کامل آزادی دے دی۔ اُس نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ یہاں کسی پابندی کے بغیر رہے۔ اُس کو اختیار رہے کہ وہ اپنی آزادی کو چاہے تو غلط طور پر استعمال کرے اور چاہے تو درست طور پر استعمال کرے۔ ہر انسان جو زمین پر پیدا ہوتا ہے، اُس کے ساتھ خدا کے دو غیر مَرئی (invisible) فرشتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ وہ انسان کے ہر قول اور عمل کا مکمل ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر اس کے لیے اگلی دنیا میں جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔

جنتی دنیا میں انسان کامل آزادی کے ساتھ رہے گا، لیکن وہ اتنا زیادہ پختہ اور اتنا زیادہ باشعور ہوگا کہ وہ کسی بھی حال میں اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرے گا۔ وہ پوری طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی پوری طرح ڈسپلن میں رہے گا۔ یہی وہ انسان ہے جس کے سلیکشن کے لیے موجودہ زمینی سیّارہ بنایا گیا۔ موجودہ دنیا میں بھی وہ سارے حالات پائے جاتے ہیں جو جنتی دنیا میں موجود ہوں گے۔ اب یہ دیکھا جارہا ہے کہ وہ کون انسان ہے جس نے ہر قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جنتی کیریکٹر کا ثبوت دیا۔ اُسی انسان کا انتخاب کرکے اس کو جنتی دنیا میں ابدی طور پر بسادیا جائے گا۔

ہر انسان کے ساتھ خدا کے غیر مرئی فرشتے لگے ہوئے ہیں اور وہ ہر لمحہ اس کا ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ یہی انسان کا ٹسٹ ہے، اور اِسی ٹسٹ کے نتیجے کی بنیاد پر ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی ہر موقع پر خدائی کی بڑائی کا اعتراف کرے، یعنی آدمی کے ضمیر نے جب اس کو ٹوکا تو اس نے ضمیر کی آواز کو مانا، یا اس کو نظر انداز کردیا۔ جب اس کے سامنے دلیل کے ساتھ ایک سچائی آئی تو وہ اس کے آگے جھک گیا، یا اس نے اس کے خلاف سرکشی دکھائی۔ جب اپنی انا اور سچائی کا مقابلہ ہوا تو وہ اپنی انا کے پیچھے چلا، یا اُس نے سچائی کا اعتراف کیا۔

اِسی طرح لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ انصاف پر قائم رہا، یا اپنے انٹرسٹ کی خاطر

بے انصافی کرنے لگا۔ وہ صرف لوگوں کے سامنے اچھا بنا رہا، یا اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی وہ اچھائی پر قائم رہا۔ اس نے حق کو اپنا سپریم کنسرن بنایا، یا حق کے سوا کسی اور چیز کو وہ اپنا کنسرن بنائے رہا۔ اسی طرح یہ کہ جب اس کو اقتدار ملا تو وہ بگاڑ کا شکار ہو گیا، یا اقتدار کے باوجود اس نے اپنے آپ کو انصاف پر قائم رکھا۔ جب اس کو دولت حاصل ہوئی یا اس کو غریبی کا تجربہ ہوا تو دونوں حالتوں میں یکساں طور پر اس نے اعتدال کا ثبوت دیا، یا وہ اعتدال کے راستے سے ہٹ گیا۔ سماجی زندگی میں جب اس کو آگے کی سیٹ ملی، اس وقت وہ کیسا تھا اور جب اس کو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنا پڑا تب اس کا رویہ کیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کو اصول کا پابند رکھا، یا اصول سے ہٹ کر وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے لگا۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

موجودہ زمینی دنیا ایک محدود مدت کے لیے بنائی گئی ہے۔ اِس مدت کے پورا ہونے کے بعد یہاں پیدا ہونے والے تمام انسان، خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔ خدا، فرشتوں کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ کے مطابق، ہر ایک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ جس عورت یا مرد کا ریکارڈ بتائے گا کہ وہ زمینی دنیا میں جنتی کردار کے ساتھ رہا، اُس نے اپنی آزادی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے دائرے کے اندر استعمال کیا اور اِس طرح یہ ثابت کیا کہ وہ جنتی دنیا کے ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہے، ایسے لوگوں کو جنت کے باغوں میں رہنے کے لیے منتخب کرلیا جائے گا۔ اور وہ تمام لوگ جو جنتی کردار کا ثبوت نہ دے سکے، اُن کو رد کر کے کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے مایوسی اور حسرت کی زندگی گزارتے رہیں اور کبھی اُس سے چھٹکارا نہ پاسکیں۔

جنت کا راستہ، جہنم کی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے

دنیا، آخرت

قرآن میں انسان کے بارے میں ایک عمومی تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَاءَھُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا (76:27)۔ یعنی یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز کو چاہتے ہیں اور انھوں نے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو چھوڑ رکھا ہے۔

انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اس کی مدتِ حیات کے دو حصے ہیں — موت سے قبل (pre-death period) اور موت کے بعد (post-death period)۔ انسان کی عام کمزوری یہ ہے کہ وہ قبل از موت زندگی کو لے کر سوچتا ہے، بعد از موت زندگی کو لے کر وہ سوچ نہیں پاتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہی بات ہے جو انسان کی پوری سوچ کو صحیح رخ یا غلط رخ دیتی ہے۔ جو شخص موت سے قبل کے مسائل کو لے کر سوچے، اس کے اندر دنیا رخی سوچ (world-oriented thinking) ڈیولپ کرے گی۔ اس کی سوچ ہر اعتبار سے، غیر حقیقت پسندانہ سوچ بن جائے گی۔ اس کے برعکس، جو شخص موت کے بعد کے مسائل کو لے کر سوچے، اس کے اندر آخرت رخی سوچ (Akhirat-oriented thinking) ڈیولپ ہوگی۔ اس کی سوچ ہر اعتبار سے حقیقت پسندانہ سوچ بن جائے گی۔ حقیقت پسندانہ سوچ ہی کا دوسرا نام صحیح طرزِ فکر (right thinking) ہے۔ اِسی طرح غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہی کا دوسرا نام غلط طرزِ فکر (wrong thinking) ہے۔

انسان کے بننے یا بگڑنے کا تمام تر انحصار اِسی بات پر ہے۔ جو شخص اپنے اندر دنیا رخی مزاج ڈیولپ کرے گا تو یہ اس کی پوری سوچ کو غلط رخ پر ڈال دے گا۔ اِس کے برعکس، جس آدمی کا ذہن آخرت رخی ذہن ہو، اس کے اندر آخرت رخی مزاج ڈیولپ کرے گا جو اس کی پوری سوچ کو صحیح سمت میں جاری کر دے گا — یہی وہ چیز ہے جو انسان کی شخصیت کی تعمیر (personality building) میں اصل اہمیت رکھتی ہے۔

جنت کی نرسری

کسی انسان کے لیے اِس دنیا میں سب سے پہلی جاننے کی چیز یہ ہے کہ وہ یہ دریافت کرے کہ جس ہستی نے انسان کو اور اس دنیا کو بنایا ہے، اس کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کیا ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن کے مطالعے سے جو چیز معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے ایک وسیع اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت (Paradise) ہے۔ پھر اس نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کو اس جنت میں بسایا۔

انسان کو خدا نے مکمل آزادی (freedom of choice) عطا کی۔ انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ خالق کا اعتراف کرے، وہ خود اپنے اختیار سے سلف ڈسپلنڈ (self-disciplined) زندگی گزارے۔ لیکن انسان اِس امتحان میں پورا نہیں اترا۔ اُس نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس کے بعد خدا نے انسان کے بارے میں دوسرا اصول مقرر کیا۔ پہلے انسان کو عمومی بنیاد (general basis) پر جنت میں بسایا گیا تھا، لیکن جب انسان مقرر کردہ معیار پر پورا نہیں اترا تو اس کے بعد خدا نے یہ طے کیا کہ انسان کے لیے جنت کا فیصلہ انتخابی بنیاد (selective basis) پر کیا جائے، یعنی صرف اُن افراد کو جنت میں آباد کیا جائے جو سلف ڈسپلن (self-discipline) کے مطلوب معیار پر پورے اتریں۔ اس مقصد کے لئے خدا نے ابدی جنت کے سوا ایک اور عارضی دنیا بنائی۔

یہ عارضی دنیا ہمارا موجودہ سیارۂ ارض (planet earth) ہے۔ سیارۂ ارض گویا ابدی جنت کو فیڈ (feed) کرنے کے لئے عارضی قسم کی ایک زندہ نرسری (living nursery) ہے۔ اس سیارۂ ارض پر انسان گویا پودے (plants) کی مانند اگائے جاتے ہیں۔ اُن کو یہاں کے مختلف حالات میں محدود مدت کے لئے زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اِس مدت میں انسان فرشتوں کے سپروژن (supervision) میں ہوتا ہے۔ فرشتے مسلسل واچ (watch) کرتے ہیں کہ کوئی انسان مختلف حالات میں کس قسم کا رسپانس (response) دے رہا ہے اور اپنے اندر کس قسم کی

پرسنالٹی کی تشکیل کر رہا ہے۔ پھر جو فرد (individual) اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مطلوب معیار کے مطابق ہے، اس کو عارضی نرسری سے نکال کر جنت کی ابدی باغ میں نصب کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ وہاں جنت کے ماحول میں فروغ پائے اور ابدی طور پر ترقی کا سفر طے کرتا رہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ کسی فرد کو سیارۂ ارض سے ٹرانسفر کر کے ابدی جنت میں پہنچا دیا جائے۔

دو دنیائیں

قرآن کی سورہ الذاریات میں تخلیق کا ایک اصول اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (51:49)۔ یعنی ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فطرت کا یہ نظام ہے کہ یہاں تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی صورت میں پیدا کی گئی ہیں۔ اِسی طرح موجودہ دنیا بھی دو دنیا (pair world) کی صورت میں بنائی گئی ہے۔ سیارۂ ارض (planet earth) اس کا ایک جوڑا ہے۔ اس کا دوسرا جوڑا آخرت کی دنیا ہے، جہاں جنت (Paradise) واقع ہے۔ جنت موجودہ دنیا کا تکمیلی حصہ (complementary part) ہے۔ جنت کے بغیر موجودہ دنیا نا قابلِ فہم ہے، لیکن جنت کے ساتھ وہ پوری طرح قابلِ فہم بن جاتی ہے۔

جنت کی نرسری

خالق نے ایک عظیم دنیا بنائی۔ یہ دنیا ہر لحاظ سے آئڈیل اور پرفکٹ تھی۔ اِس دنیا کا نام جنت ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت آدم کی تخلیق سے پہلے بنائی گئی (البقرۃ: 35)۔ اس کے بعد خالق نے چاہا کہ وہ اُن عورتوں اور مردوں کا انتخاب کرے جو اِس جنتی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ اِس مقصد کے لیے خالق نے سیارہ ارض بنایا۔ یہ سیارہ ارض گویا جنتی دنیا کی نرسری (nursery) ہے۔ نرسری اُس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں پودے اگائے جائیں اور پھر منتخب پودوں کو وہاں سے نکال کر اُن کو باغ میں نصب کیا جائے:

Nursery: A place where plants are reared for transplantation.

موجودہ زمین اِسی قسم کی ایک نرسری ہے۔ یہاں مسلسل طور پر انسان پیدا کیے جارہے ہیں۔ زمین پر وہ تمام حالات رکھے گئے ہیں جو نرسری کی حیثیت سے اس کے تقاضے پورے کرنے والے ہیں۔ ہر عورت اور مرد اپنے عمل سے اپنے اندر مثبت شخصیت یا منفی شخصیت کی تعمیر کررہے ہیں۔ موت وہ وقت ہے جب کہ ایک ''پودا'' اپنی مدت پوری کرنے پر نرسری سے اکھاڑ دیا جائے، پھر اگر وہ نامطلوب شخصیت بنا ہے تو اس کو رد کردیا جائے اور اگر اس نے اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کی ہے تو اس کو وہاں سے نکال کر جنت میں بسا دیا جائے — موجودہ دنیا اِس لیے ہے، تا کہ یہاں ایک فرد اپنے آپ کو اسپریچول شخصیت کی حیثیت سے تیار (develop) کرے اور پھر جنت میں وہ اسپریچول تہذیب کا ابدی حصہ بن جائے۔

جنت کی دنیا انسان کی اصل منزل ہے۔ موجودہ عارضی دنیا نرسری (nursery) کی مانند ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے عورت اور مرد کی حیثیت گویا نرسری کے پودے کی ہے۔ اِس محدود مدت میں جو ''پودے'' صحت مندی کا ثبوت نہ دیں، ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا اور جو ''پودے'' اپنی نشو ونما کے دوران صحت مند ثابت ہوں، اُن کو باعزت طور پر موجودہ عارضی دنیا سے منتقل کرکے آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جائے گا، یعنی جنت کی دنیا میں۔ اِس حقیقت کو ایک اور آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِيْ خَلَقَ الموْتَ وَالحيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ (67:2) یعنی اللہ، جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تا کہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر بے شمار عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں۔ وہ محدود مدت تک زندگی گزار کر مرجاتے ہیں، یہ ساری بھیڑ خالق کا مطلوب نہیں۔ خالق کا مطلوب صرف وہ فرد ہے جو اِس امتحانی دورِ حیات میں یہ ثابت کرے کہ وہ پورے معنوں میں احسن العمل (best in deeds) ہے۔ زمین کی حیثیت نرسری کی ہے، اِس لیے یہاں ہر قسم کے پودے اگتے ہیں۔ لیکن جنت کی حیثیت مطلوب منزل کی ہے، اِس لیے وہاں صرف وہی استثنائی افراد بسائے جائیں گے جن کو اُن

کے ریکارڈ کی بنیاد پر منتخب کیا جائے۔

موجودہ دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ گویا نرسری کا ایک پودا ہے۔ ایک محدود مدت تک وہ اِس ابتدائی دنیا میں رہتا ہے۔ اِس دوران اُس کے ساتھ مختلف قسم کے حالات گزرتے ہیں۔ یہ حالات گویا اُس کے لیے تربیتی کورس (training course) ہیں۔ یہ حالات اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرے۔ موت اِس تربیتی کورس کے خاتمے کا اعلان ہے۔ جو انسان اِس ملی ہوئی مدت کے دوران اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرلے، اس کو نرسری سے نکال کر دوسری دنیا میں ابدی طور پر بسا دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ مطلوب انداز میں اپنی تعمیر نہ کرسکیں، اُن کو نرسری سے نکال کر باہر پھینک دیا جائے گا۔

اِس دنیا کے لیے خالق کا نشانہ اجتماعی نہیں ہے، بلکہ انفرادی ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ موجودہ دنیا تعمیر نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ تعمیر شخصیت کے لیے ہے۔ یہاں صرف تعمیرِ شخصیت ممکن ہے، آئڈیل معنوں میں تعمیرِ نظام یہاں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ انسانی زندگی کی یہی تعبیر صحیح تعبیر ہے۔ اِس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو ماننے کی صورت میں زندگی کے تمام سوالات کا قابلِ فہم جواب مل جاتا ہے:

With this description of human life, everything falls into place.

ایک حدیث

تخلیق کا یہ منصوبہ قرآن وحدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ اِس سلسلے کی دو روایتیں یہ ہیں:

1— عن ابن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لقيتُ إبراهيم ليلة أسرى بي- فقال يا محمد، أقرئ أمتك مني السلام، وأخبرهم أن الجنة طيبة التربة، عذبة الماء، وأنها قيعان، وأن غراسها: سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا

الله، و الله أكبر ۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 105)

حضرت عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میں میری ملاقات حضرت ابراہیم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اے محمد، اپنی امت کو میرا اسلام پہنچا دو۔ اور اُن کو بتاؤ کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ مٹی ہے، اس کا پانی بہت میٹھا ہے اور وہ ایک ہموار میدان ہے۔ اس کا پودا سبحان الله، و الحمد لله، و لا إله إلا الله، و الله أكبر ہے۔

2- عن أبي أيوب الأنصاري أن رسول الله صلى الله عليه و سلم ليلة أسري به مرّ على إبراهيم، فقال من معك يا جبريل، قال: هذا محمد. فقال له إبراهيم: مُر أمتك فليكثروا من غراس الجنة، فإن تربتها طيبة و أرضها واسعة. قال: و ما غراس الجنة، قال: لا حول و لا قوة إلا بالله ۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 7966)

حضرت ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات میں حضرت ابراہیم کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے کہا کہ اے جبریل، یہ تمھارے ساتھ کون ہیں۔ جبریل نے کہا کہ یہ محمد ہیں۔ حضرت ابراہیم نے آپ سے کہا کہ اپنی امت کو بتاؤ کہ وہ جنت میں کثرت سے پودے لگائیں، کیوں کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ ہے اور اس کی زمین بہت وسیع ہے۔ آپ نے پوچھا کہ جنت کا پودا کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا کہ: لا حول و لا قوة إلا بالله۔

مذکورہ روایات میں جنت کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں— قیعان اور ارضِ واسعہ۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے، یعنی وسیع اور ہموار زمین۔ یہ تمثیل کی زبان میں جنت کی اصل حقیقت کا بیان ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایک اعلیٰ مخلوق پیدا کرے اور پھر اِس مخلوق کو وہ اپنی اعلیٰ ترین نعمت سے نوازے۔ اِس منصوبے کے تحت، اللہ نے ایک معیاری دنیا بنائی۔ یہ دنیا اپنی وسعت کے اعتبار سے، اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات تھی۔ اِس میں ہر قسم کے اعلیٰ امکانات رکھے گئے تھے۔ اِس میں نہ صرف ہر قسم کی نعمتیں تھیں، بلکہ اس میں اعلیٰ ترقی کے ابدی مواقع موجود تھے۔

اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو مکمل آزادی عطا کی۔ جنت اِسی انسان کے فطری ہیبی ٹیٹ (natural habitat) کے طور پر بنائی گئی ہے۔ اِس جنت میں انسان کا داخلہ انتخاب (selection) کی بنیاد پر مقرر کیا گیا۔ موجودہ سیارہ ارض اِس مقصد کے لیے سلیکشن گراؤنڈ یا نرسری کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو پیدا کرکے اس کو مکمل آزادی دے دی گئی ہے۔ آزادی کے اِس ماحول میں جو عورت یا مرد اپنے آپ کو جنت کی دنیا میں بسائے جانے کا مستحق ثابت کریں، اُن کو منتخب کرکے یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ جنت میں آباد ہو کر مزید ترقی کی منزلیں طے کریں۔ اِس کے برعکس، جو افراد زمینی زندگی کے امتحان میں ناکام ہوجائیں، اُن کو رد کرکے کائناتی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں تمثیل کی زبان میں بتایا گیا ہے کہ جنت کا معاملہ کیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اللہ کے سچے بندوں کے رہنے کی بہترین جگہ ہے۔ وہ ایک عالی شان رہائش گاہ ہے، مگر اپنی ابتدائی صورت میں وہ ایک غیر آباد جگہ ہے۔

اِس ابدی جنت کی آبادکاری کے لیے اللہ تعالی نے یہ انتظام کیا کہ موجود سیارہ ارض کو ایک نرسری یا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنایا۔ موجودہ زمین پر جو عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں، وہ گویا نرسری میں لگائے جانے والے پودے ہیں۔ ان پودوں میں جو پودا یہ ثابت کرے گا کہ وہ صحت مند پودا (healthy plant) ہے، اس کو دنیا کی نرسری سے نکال کر جنت کے زیادہ بہتر اور ابدی مقام پر نصب کردیا جائے گا، تاکہ وہ وہاں کے بہتر ماحول میں پرورش پا کر مزید ترقی کرے اور ابدی طور پر جنت کے شاداب باغ کا حصہ بن جائے۔

اِس حدیث میں جن کلمات (سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر، ولا حول ولا قوة إلا بالله) کا ذکر ہے، وہ بہ اعتبار لفظ مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ باعتبارِ معنی مراد ہیں، یعنی اِن الفاظ میں جس آئڈیالوجی کا ذکر ہے، یہ الفاظ جس معرفت کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ جس طرزِ فکر (way of thinking) کو بتاتے ہیں، اُس کے مطابق، اپنی سوچ کو بنانا، اس کے مطابق، اپنی

شخصیت کی تعمیر کرنا، اِن کلمات کی اسپرٹ کو پنے دل ودماغ میں اتارنا، یہاں تک کہ آدمی ربانی صفات والا انسان بن جائے۔ جو آدمی قبل ازموت دورِحیات میں اِن کلمات کے تقاضے کے مطابق، اپنے آپ کو ڈھالے گا، وہ بعد ازموت دورِحیات میں خدا کے اُس باغ میں بسنے کا مستحق قرار پائے گا جس کو جنت (Paradise) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں جنت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن ایک اعتبار سے، جنت کا تعارف ہے۔ یہ تعارف اتنے موثر انداز میں ہے کہ اس کو پڑھنے والا آدمی گویا جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اگر آپ اِس اعتبار سے، قرآن کا تتبع کریں اور جنت کی آیتوں کو یکجا کر کے اس کا مطالعہ کریں تو آپ کے اندر شدید طور پر یہ جذبہ ابھرے گا کہ آپ جنت کو اپنی منزل بنالیں، آپ کی تمام سرگرمیوں کا رخ جنت کی طرف ہوجائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لِمِثْلِ هَـٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)۔

ابدی عمر، ابدی صحت، ابدی امن

قرآن اور حدیث میں جنت اور اہلِ جنت کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ابدی طور پر ہر قسم کی نعمتیں کمال درجے میں موجود ہوں گی۔ وہاں انسان کی ہر اشتہا (desire) کی تکمیل کا سامان ہوگا۔ وہاں انسان کو کامل معنوں میں فل فِل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ جنت میں انسان کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ مسلسل طور پر وہاں کی نعمتوں کو انجوائے کرے اور کبھی بورڈم کا شکار نہ ہو۔ جنت ہر اعتبار سے اہلِ جنت کے لیے آئڈیل اور پرفکٹ دنیا ہوگی۔

مگر اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ وجود کے ساتھ جنت کی نعمتوں سے حقیقی معنوں میں محظوظ نہیں ہوسکتا۔ اِس لیے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو وجود ملا ہے، وہ ہر اعتبار سے، ایک محدود وجود ہے — اِس وجود پر بڑھاپا آتا ہے، یہ وجود بیماری اور حادثات سے دوچار ہوتا ہے، یہ وجود زوال (de-generation) کا شکار ہوتا ہے، اِس وجود پر موت طاری ہوتی ہے، اِس وجود کے آرگن (organs) کمزور ونا کارہ ہوتے رہتے ہیں، اِس وجود پر نینداور تھکاوٹ طاری ہوتی

ہے، اِس وجود کے حواس (senses) معطل ہوتے رہتے ہیں، وغیرہ۔

ایسی حالت میں انسان کو اگر جنت اِس طرح ملے کہ جنت میں ہر قسم کا سامانِ عیش تو کامل طور پر موجود ہو، لیکن انسان کا وجود یہی موجودہ دنیا والا وجود ہو، جو کہ ہر قسم کی کمزوریوں (weaknesses) کا شکار ہوتا ہے، اس کو ہر قسم کی محدودیت (limitations) لاحق ہوتی ہے، اس کو بدستور جسمانی زوال (physical degeneration) پیش آتا رہے، جیسا کہ وہ اِس دنیا میں پیش آتا تھا۔ اگر ایسا ہو تو انسان کے لیے جنت اینٹ پتھر کا ایک ڈھیر بن جائے گی، وہ اس کے لیے لذت اور خوشی کی جگہ ثابت نہ ہوگی۔ جنت انسان کے لیے صرف اُس وقت جنت ہے جب کہ وہ خود جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

اگر انسان کے اپنے اندر جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت نہ ہو تو جنت اس کے لیے بلا شبہ ایک مصیبت خانہ ہوگی، نہ کہ کوئی عیش خانہ۔ جنت اسی طرح اس کے لیے ایک دار الکبد ہوگی، جیسا کہ موجودہ دنیا اس کے لیے دار الکبد تھی۔ اِس کا تقاضا ہے کہ اہلِ جنت کو آخرت میں جنت کے ساتھ ایک نیا وجود بھی عطا کیا جائے، ایسا وجود جو ابدی عمر رکھتا ہو، اس کو ایسی صحت ملے جو بھرپور صحت (health in full swing) کی حامل ہو۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص موجودہ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (spiritually purified personality) کی حیثیت سے ڈیولپ (develop) کرے، اس کو آخرت میں اللہ کے خصوصی عطیہ کے طور پر جسمانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (physically purified personality) حاصل ہوگی۔ ایسی شخصیت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتبار سے، کامل صفات کی حامل ہوگی۔ وہ اِس قابل ہوگی کہ جنت کی نعمتوں سے بھرپور طور پر حظ (enjoyment) حاصل کرے، وہ کسی بھی پہلو سے محدودیت (limitation) اور ڈس ایڈوانٹج (disadvantage) میں مبتلا نہ ہو، وہ ابدی طور پر کامل فل فل مینٹ (fulfilment) کے احساس میں جیتا رہے۔

چناں چہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنتی انسان ہمیشہ جوانی کی عمر (youth age) میں رہیں گے، جیسے کہ وہ صرف 30 سال کی عمر کے ہوں۔ وہ ہر اُس جسمانی کمزوری (physical weakness) سے مکمل طور پر پاک ہوں گے جو دنیا کی زندگی میں اُن کے جسم کا لازمی حصہ تھی۔

اِسی طرح جنت کے باشندے ہر قسم کی جسمانی کمی سے پاک ہوں گے۔ مثلاً وہ کبھی بیمار نہیں ہوں گے۔ اُن کو بول وبراز کی حاجت نہ ہوگی۔ اہلِ جنت کو جو جسم ملے گا، وہ ایسا جسم ہوگا جو ابدی طور پر شباب کی حالت میں رہے گا۔ اس پر نینداور تھکاوٹ اور بڑھاپا طاری نہیں ہوگا۔ جنت میں اہلِ جنت کو خطاب کر کے یہ اعلان کیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ صحت مندرہو گے، کبھی بیمار نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہوں گے، کبھی تم پر موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی تم بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ خوش حال رہو گے، کبھی تنگی میں مبتلا نہ ہو گے، وغیرہ۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مشکاۃ المصابیح: جلد3، کتاب أحوال القیامۃ وبدء الخلق، باب صفۃ الجنۃ وأھلھا)

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور انسان دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جنت مکمل طور پر انسان کے مطابقِ حال ہے اور انسان مکمل طور پر جنت کے مطابقِ حال۔ جنت انسان کا ہیبی ٹیٹ (habitat) ہے اور انسان جنت کا مطلوب باشندہ (citizen)۔ انسان کے بغیر جنت کا وجود ادھورا ہے اور جنت کے بغیر انسان کا وجود ادھورا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے طالب اور مطلوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنت کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی ہے اور انسان کے بغیر جنت کے وجود کی کوئی معنویت نہیں۔ یہ طالب اور مطلوب دونوں آخرت میں اکھٹا کیے جائیں گے اور اس کے بعد ابدی طور پر ایک دورِ کمال شروع ہوگا، جس کی خوشیاں کبھی ختم نہ ہوں گی، اور نہ اس کی رونق پر کبھی زوال آئے گا۔ یہ جنت انسان کا انتظار کر رہی ہے، لیکن اِس جنت میں داخلہ صرف اُس انسان کو ملے گا جو اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرے۔

دو دنیائیں

ایک سائنسی قیاس کے مطابق، کائنات میں ہماری دنیا جیسی دو دنیائیں ہیں۔ ایک پازیٹو ورلڈ اور دوسری نیگیٹو ورلڈ۔ یہی قانونِ فطرت (law of nature) کا تقاضا ہے۔ جس طرح پازیٹو پارٹیکل اور نیگیٹو پارٹیکل کے بغیر ایٹم (atom) کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ایک دنیا کے وجود کے لیے دوسری دنیا کا وجود بھی ضروری ہے۔

یہ سائنسی قیاس ہر انسان کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے کے تحت ایک دنیا پر یقین رکھتا ہے جو بظاہر اس کو دکھائی دیتی ہے، اور جس کے اندر وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ یہ دنیا وہ ہے جہاں وہ روزانہ صبح اور شام کے مناظر دیکھتا ہے۔ جس کے اندر وہ اپنی تمام سرگرمیاں جاری کرتا ہے۔ جس کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے، اور اپنے کان سے سنتا ہے، اور جہاں وہ روزانہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہر انسان ایک اور دنیا کا تصور اپنے ذہن میں لیے ہوئے ہے۔ ایک ایسی دنیا جو موجودہ دنیا کے مقابلے میں معیاری دنیا (perfect world) ہوگی، جہاں اس کی تمام خواہشات (desires) پوری ہوں گی۔ جہاں اس کو کامل فل فلمینٹ (total fulfilment) ملے گا۔ ہر انسان پیدائشی طور پر پرفکشنسٹ ہوتا ہے۔ اپنے داخلی مزاج کے مطابق وہ اس معیاری دنیا کو پانا چاہتا ہے، مگر کوئی بھی شخص اپنی اس تلاش کا جواب نہیں پاتا، اور اس پر موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس طرح ہر انسان کے ذہن میں ایک دنیا وہ ہے جس کو عملاً وہ پائے ہوئے ہے، اور دوسری دنیا وہ ہے جس کو وہ پانا چاہتا ہے، لیکن اس کو پانے میں وہ کامیاب نہیں ہوتا ہے۔

انسان کا یہ ذہن ہر ایک کے لیے اس بات کا ایک داخلی ثبوت ہے کہ یہاں دو دنیائیں موجود ہیں۔ ایک دنیا وہ جس کو وہ حال میں پا رہا ہے، اور دوسری دنیا وہ جس کو وہ موت کے بعد مستقبل میں پائے گا۔ پہلی دنیا ہر ایک کا عملی تجربہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری دنیا وہ ہے جو ہر ایک کے ذہن میں بسی ہوئی ہے۔

انسان کی دریافت

خدا تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے—

God is the eternal source of all kinds of beauty and goodness.

خدا نے انسان کو بنایا۔ انسان اپنی ذات میں ایک مکمل وجود ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں کمال کے درجہ میں موجود ہیں۔ انسان کے دماغ (brain) میں 100 million billion billion پارٹیکل ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان کے خالق نے انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔

اسی کے ساتھ انسان کو ایک ایسی انوکھی چیز دی گئی ہے جو وسیع کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔ یہ ہے احساسِ مسرّت۔ انسان اس کائنات میں واحد مخلوق ہے جو pleasure کا احساس رکھتا ہے اور pleasure سے انجوائے کرنے کی لامحدود capacity کا مالک ہے۔ انسان کے لیے ہر چیز امکانی طور پر خوشی کا ذریعہ ہے۔

خدا نے اسی قسم کی انوکھی صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو پیدا کیا۔ اس کے بعد خدا نے ایک حسین دنیا بنائی جس کا نام اس نے جنت رکھا۔ جنت ایک perfect world ہے جس میں ہر قسم کا pleasure اپنی آخری perfect صورت میں موجود ہے۔ انسان اور یہ جنت دونوں گویا ایک دوسرے کا مثنیٰ (کاؤنٹر پارٹ) ہیں۔

انسان جنت کے لیے ہے اور جنت انسان کے لیے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو پورا fulfilment ملے۔ جنت گویا انسان کی تکمیل ہے۔ جنت کے بغیر انسان بے معنی ہے اور انسان کے بغیر جنت بے معنیٰ۔ جنت کے بغیر انسان کی زندگی ادھوری ہے اور انسان کے بغیر جنت ادھوری۔

انسان اس جنت کا امکانی باشندہ ہے مگر یہ جنت کسی انسان کو پیدائشی یا نسلی حق کے طور پر

نہیں ملتی۔ جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ انسان یہ ثابت کرے کہ وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اسی مقصد کے لیے selection ground کے طور پر بنایا ہے۔ موجودہ دنیا کے حالات اس طرح بنائے گئے ہیں کہ یہاں کا ہر جزء انسان کے لیے ایک ٹسٹ پیپر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں انسان ہر لمحہ trial پر ہے۔ خدا ہر انسان کے قول وعمل کا record تیار کر رہا ہے۔ اسی record کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ کون عورت اور مرد ہیں جو جنت میں بسانے کے لیے اہل باشندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انسان کو اس دنیا میں مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہ آزادی انعام کے طور پر نہیں بلکہ test کے طور پر ہے۔ خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ انسان اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جو عورت اور مرد اپنی آزادی کو خدا کے نقشہ کے مطابق درست طور پر استعمال کریں ان کو جنّت میں بسانے کے لیے چُنا جائے گا اور جو لوگ آزادی کو misuse کریں وہ day of judgement میں قابلِ رد (rejected lot) قرار پائیں گے۔

انسان کی زندگی دو دوروں میں تقسیم ہے۔ قبل از موت دور (pre-death period) اور بعد از موت دور (post-death period)۔ قبل از موت دور امتحانی دور (trial period) ہے اور بعد از موت دور انعام پانے کا دور (reward period)۔ یہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو جاننے اور اختیار کرنے میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا راز چھپا ہوا ہے۔

زندگی کیا ہے، موت کی طرف سفر
موت کیا ہے
نئی طویل تر زندگی کا آغاز

آخرت سے غفلت کیوں؟

قرآن کی سورہ الروم میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا، وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ (30:7) یعنی وہ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے بے خبر ہیں۔

یہ واقعہ کیسے پیش آتا ہے کہ انسان آخرت سے غافل ہوجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے۔ اُس کا ہر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے سوا ایک اور دنیا کے اندر ہے۔ اس کے تمام تعلقات اِسی معلوم دنیا کے ساتھ ہوتے ہیں۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک اس کی پوری زندگی اِسی دنیا کے اندر گزرتی ہے۔ اِس طرح وہ موجودہ دنیا کے ساتھ اتنا زیادہ مانوس ہوجاتا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ بظاہر جو کچھ ہے، وہی کُل دنیا ہے، اِس کے آگے اور کچھ نہیں، حتی کے وہ لوگ جو رسمی عقیدے کے طور پر آخرت کو مانتے ہیں، وہ بھی عملاً پوری طرح اِس کا مصداق ہوتے ہیں۔

ایسی حالت میں آخرت پر زندہ یقین صرف اُس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو اپنے اندر تجریدی فکر (detached thinking) پیدا کرے، یعنی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے الگ ہو کر سوچنا، جسمانی اعتبار سے بظاہر اِسی دنیا میں ہونا، لیکن سوچ کے اعتبار سے آخرت کی دنیا میں پہنچ جانا۔ یہی تجریدی فکر کا طریقہ واحد طریقہ ہے جو کسی آدمی کو آخرت کی یاد میں جینے والا بنا سکتا ہے۔ یہی آخرت رخی سوچ وہ چیز ہے جس سے آدمی کے اندر حقیقی معنوں میں ربانی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور طریقہ ربانی شخصیت کی تعمیر کا نہیں۔

ربانی انسان بننے کی شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو النفس المطمئنة (complex free soul) بنائے (الفجر: 27)۔ ایسے ہی انسان کو اللہ کی توفیق حاصل ہوتی ہے اور یہ صرف اللہ کی توفیق ہے جو کسی انسان کو ربانی انسان بناتی ہے۔

واپسی ممکن نہ ہوگی

آج کل کے لوگوں کو جب میں ہنستے ہوئے اور تفریح کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک عجیب دھکّا لگتا ہے۔ شدّتِ احساس سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ کیسا عجیب انجام ان کے سامنے آنے والا ہے، لیکن وہ اِس سے بے خبر ہو کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ وہ جلد ہی ایک بھیانک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ وہ اِس انجام سے اپنے آپ کو ہرگز بچا نہیں سکتے، لیکن اُس سے کامل بے خبری کی بنا پر وہ قہقہہ لگا رہے ہیں۔ حالاں کہ ضرورت یہ تھی کہ وہ چپ ہوجائیں اور آنے والے بھیانک انجام سے بچنے کی تدبیر کریں۔

یہ انجام موت ہے۔ ہر آدمی جو پیدا ہوا ہے، اس کو بہر حال مرنا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا اور نہ وہ اِس پر قادر ہے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی سے محروم کرلے۔ پیدا ہونے کے بعد ہر آدمی ابدی ہو چکا ہے۔ ہر آدمی کو بہر حال جینا ہے، حتی کہ موت کے بعد بھی۔ موت کے بعد اچانک ہر آدمی اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پائے گا، جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ اِس اگلی دنیا میں آدمی اِس حال میں پہنچے گا کہ اُس کے پاس موجودہ دنیا کی طرف دوبارہ آنے کے لیے رِٹرن ٹکٹ نہ ہوگا۔ موجودہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں کوئی جزا نہیں۔ اگلی دنیا جزا کی دنیا ہوگی، وہاں کسی کے لیے عمل کا موقع نہ ہوگا۔ یہ ہر عورت اور ہر مرد کا مقدر ہے، کوئی بھی شخص اپنی اِس تقدیر کو بدل نہیں سکتا۔

موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے ہم کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ پیدا کرنے والے کا تخلیقی پلان (creation plan) کیا ہے۔ پیدا کرنے والے نے یہ عجیب وغریب دنیا کیوں بنائی اور اس کے اندر انوکھی صلاحیتوں والا انسان کس لیے بسایا۔ لوگوں کی موجودہ بے خبری اِس تخلیقی پلان کو نہ جاننے کی بنا پر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی اور انجام اُن کے سامنے آنے والا نہیں۔ اگر انسان یہ جانے کہ وہ ایک لمبے سفر کا مسافر ہے۔ اس کو موجودہ دنیا سے گزر کر آخرت کی دنیا میں داخل ہونا ہے تو اس کی زندگی کا سارا نقشہ بدل جائے۔

زندگی کے اُس پار

آدمی بظاہر ایک کامل وجود ہے۔ مگر حقیقت میں وہ صرف ایک ناقص وجود ہے۔ انسان کے پاس آنکھ ہے، مگر وہ خارجی روشنی کے بغیر دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کان ہے، مگر خارجی ہوا کے بغیر وہ سن نہیں سکتا۔ انسان کے پاس چلنے کے لیے پاؤں ہے، مگر زمین میں متوازن قوتِ کشش نہ ہو تو وہ چل نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کھانے کے لیے منھ ہے، لیکن خارج میں غذا کا سامان نہ ہو تو وہ کھانے کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

اب ایک ایسے وقت کا تصور کیجیے، جب کہ آپ پوری طرح اپنے اِسی وجود کے ساتھ زندہ حالت میں ہوں، لیکن وہاں آپ کی ضرورت کے تمام خارجی سامان آپ سے چھن چکے ہوں۔ آپ کے پاس آنکھ ہو، مگر وہاں دیکھنے کے لیے خارجی روشنی موجود نہ ہو۔ آپ کے پاس منھ ہو، لیکن کھانے کی چیزیں وہاں سے غائب ہوچکی ہوں۔ آپ کے پاس پاؤں ہو، مگر وہاں متوازن کشش والی زمین آپ کے پاؤں کے نیچے موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہاں آپ اکیلے ہوگئے ہوں۔ آپ کے تمام اپنے لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔ یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ یہی صورتِ حال ہر عورت اور مرد کے ساتھ موت کے بعد پیش آنے والی ہے، اور موت ہر عورت اور مرد پر لازماً آنے والی ہے۔ کوئی بھی شخص جو آج زندہ ہے، وہ ضرور ایک دن مرے گا۔ اور پھر موت کے بعد وہ اپنے آپ کو جس دنیا میں پائے گا، وہ وہی دنیا ہوگی جس کا بیان اوپر کیا گیا۔

یہ آنے والا دن ہر ایک کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس آنے والے دن کو جانے اور اس کے لیے تیاری کرے۔ وہ دن جب آئے گا، تو وہ پوائنٹ آف نو رٹرن (point of no return) کی سطح پر آئے گا۔ اس کے بعد آدمی کو صرف بھگتنا ہوگا، نہ کہ پیچھے لوٹ کر دوبارہ تیاری کرنا۔ پیدائش کے بعد ہی ہر عورت اور مرد کا، کاؤنٹ ڈاؤن (countdown) شروع ہوجاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا یہ کاؤنٹ ڈاؤن کب اپنے آخری نمبر پر پہنچ جائے۔

موت کے بعد

موت ہر انسان کے لیے ایک غیر مطلوب واقعہ ہے۔ آدمی لمبی مدت تک جینا چاہتا ہے، مگر وہ اچانک ایک دن مرجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سفر میں تھا، وہ زیادہ دور تک جانا چاہتا تھا، مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے موت نے یک طرفہ فیصلے کے تحت، اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ہر عورت اور ہر مرد کا سوال ہے۔ ہر ایک یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیوں کر ایسا ہوتا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا۔ کیوں ایسا ہے کہ آدمی زیادہ دن تک جینا چاہتا ہے، مگر اس کو درمیان ہی میں اس کی مرضی کے بغیر، موت کے فیصلے کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

جب ہم اِس معاملے پر غور کرتے ہیں تو ہم کو سب سے پہلا سُراغ (clue) ڈی این اے (DNA) کی جدید دریافت میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر انسان کے اندر اس کا ڈی این اے بھی موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کا ڈی این اے گویا کہ اس کی شخصیت کا مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اِس ڈی این اے کو ڈی کوڈ (decode) کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری بڑی سے بڑی انسائیکلو پیڈیا سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ بڑا ہے۔ ہر انسان کے ڈی این اے میں اس کی شخصیت (personality) کے تمام چھوٹے اور بڑے پہلو موجود ہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ ڈی این اے انسانی شخصیت کے صرف ایک پہلو کے اندراج سے خالی ہے۔ کسی انسان کے ڈی این اے کا مطالعہ کرکے، اس کے بارے میں ہر بات کو معلوم کیا جاسکتا ہو، مگر صرف ایک بات کو معلوم کرنا ممکن نہیں، اور وہ یہ کہ کسی انسان کی موت کب واقع ہوگی۔ یہ فطرت کی طرف سے اِس بات کا اعلان ہے کہ انسان اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک نہ مرنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے لیے مسلسل زندگی ہے، حقیقی معنوں میں اس کی شخصیت پر موت وارد ہونے والی نہیں۔

اب یہاں انسانی شخصیت کے ایک اور پہلو کو شامل کرلیجیے، وہ یہ کہ تمام ذی حیات چیزوں میں صرف انسان ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ تمام حیوانات صرف آج (today)

میں جیتے ہیں، کسی حیوان کا کوئی کل نہیں۔ اپنے محدود شعور کے اعتبار سے حیوانات میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آج میں پیدا ہوئے، اور آج ہی میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو واضح طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔

اِس معاملے میں درست رائے قائم کرنے کے لیے ایک پہلو کو شامل کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر آدمی جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ان گنت تمناؤں (ambitions) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی اِس طرح مر جاتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ اِس اعتبار سے، ہر آدمی نامکمل تمناؤں (unfulfilled desires) کا کیس ہے۔ کائنات کے عام نظام کو دیکھیے تو یہ واقعہ بالکل بے جوڑ ہے۔ اِس وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جو اِس مسئلے سے دوچار ہے، انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق اِس مسئلے سے دوچار نہیں۔

یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ اِس مسئلے کا جواب ہونا چاہیے۔ انسان کی تمناؤں کو اُسی طرح فل فل مینٹ ملنا چاہیے جس طرح دوسری مخلوقات کو ملا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا آنے والی ہے، یعنی وہ دنیا جہاں انسان اپنی تمناؤں کی کامل تسکین پا سکے۔

اِس طرح اِس معاملے کا ایک اور پہلو بہت زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ انسان کے اندر فطری طور پر انصاف (justice) کا ذہن پایا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اِس دنیا میں عدل کے ساتھ فیصلہ ہو۔ نیک لوگوں کو ان کی نیکی کا پورا بدلہ ملے، اور بُرے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ تقاضا بھی چاہتا ہے کہ ایک دنیا آئے، جہاں عدل کا یہ تقاضا پورا ہو۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مذکورہ سوالات کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو آخرت (hereafter) کا نظریہ بالکل حقیقی نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ آخرت کے نظریے کو ماننے کی صورت میں آدمی کو ہر سوال کا مکمل جواب مل جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر درست ہو جاتی ہے:

Every thing falls into place.

موت کی غیر یقینی دیوار

چنالا (دھنباد) میں ایک پرانی کوئلہ کی کان (mine) تھی جو 1945 سے بند تھی۔ ساڑھے چار سو فٹ گہری اس کان میں دھیرے دھیرے پانی بھر گیا۔ اس سے 80 فٹ کے فاصلہ پر دو سال پہلے ایک اور کان کھودی گئی۔ عالمی بنک اور بیرونی ماہرین کی مدد سے تیار کی ہوئی یہ کان جدید طرز کی مشینوں سے آراستہ تھی۔

27 دسمبر 1975ء کو اس کان میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ دونوں کانوں کے درمیان 80 فٹ کا فاصلہ کافی محفوظ فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اچانک اس کے اندر تقریباً 60 فٹ چوڑا شگاف ہو گیا اور اس کے اندر سے پرانی کان کا پانی نئی کان میں اتنی تیزی سے داخل ہوا کہ صرف تین منٹ کے اندر نئی کان بھر گئی۔ 372 مزدور اور انجینئر جو اس وقت کان کے اندر کام کر رہے تھے ایک سو ملین گیلن سے بھی زیادہ پانی کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔ صرف ایک شخص بچا جو حادثہ سے صرف چند منٹ پہلے باہر آ گیا تھا۔

یہ واقعہ حیرت انگیز طور پر ہمارے زندگی کی تصویر ہے۔ ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ دیوار ٹوٹ جائے اور آخرت کے حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازی گری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوگا۔ وہ سارے لوگ ناکامی اور بربادی کے دائمی جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جو دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کر لیا ہوگا — سب سے زیادہ ہوشیار وہ شخص ہے جو اس آنے والے دن کو تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

****

ہمارے اور آخرت کے درمیان صرف ایک غیر یقینی دیوار حائل ہے

حقیقی دنیا، تصوراتی دنیا

انسان موجودہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے صبح وشام گزارتا ہے۔ مختلف تجربات کے دوران یہاں اس کی زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ان تجربات کے ذریعہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہی موجودہ دنیا حقیقی دنیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس کو محسوس ہوتا ہے کہ آخرت کی دنیا تصوراتی دنیا (imaginary world) ہے۔ دونوں دنیاؤں کے درمیان بظاہر اس فرق کی بنا پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا تفکیری عمل (thinking process) موجودہ دنیا کی سطح پر جاری ہوجاتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی منصوبہ بندی میں عملاً آخرت کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

یہ انسان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وسیع تر انجام کے اعتبار سے صحیح یہ ہے کہ انسان کے اندر آخرت رخی سوچ (Akhirat-oriented thinking) بنے، نہ کہ دنیا رخی سوچ۔ انسان کو اس معاملہ میں بے راہ روی سے بچانے کے لئے فطرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ موجودہ دنیا کو مسائل کی دنیا (دار الکبد) بنا دیا۔ یہ مسائل انسان کے لئے اسپیڈ بریکر (speed breaker) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مسائل اس لئے ہیں کہ انسان موجودہ دنیا کو حقیقی دنیا نہ سمجھے بلکہ آخرت کے اعتبار سے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ نفسیات کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ انسان کی امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے اندر تصوراتی فکر (conceptual thinking) پائی جاتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے۔ یہ تخلیقی صفت بتاتی ہے کہ انسان سے کیا مطلوب ہے۔ وہ مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کا مقصد تصوراتی فکر کے ذریعے بنائے۔

موجودہ دنیا ایک دکھائی دینے والی دنیا ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت ایک نہ دکھائی دینے والی دنیا۔ اس واقعہ کے مطابق، یہ عین درست بات ہے کہ انسان موجودہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کی دنیا کو اپنا مقصود بنائے۔ انسان تصوراتی فکر کی صفت رکھتا ہے، اس لیے اس کی زندگی کا مقصد بھی تصوراتی اعتبار سے قابلِ دریافت ہونا چاہیے۔

آخرت میں بے جگہ

دانش مند آدمی ہمیشہ مستقبل کا انجام دیکھ کر اپنے عمل کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس معنی میں ایک فارسی شاعر کا شعر ہے کہ آدمی ایسا کام کیوں کرے، جس کا نتیجہ بعد کو شرمندگی کی صورت میں نکلے:

کجا کار کند عاقل　　　کہ بعد آید پشیمانی

ایک مرتبہ میری بات ایک کمپنی کے مینیجر سے ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ زندگی میں کامیابی کے لیے محنت سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مینیجر نے کہا کہ یہ پرانے زمانے کا اصول ہے۔ موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں کامیابی کے لیے آدمی کے اندر پروفیشنل مہارت (professional expertise) ضروری ہے۔ مینیجر کی اس بات کو لے کر میں سوچنے لگا تو مجھے ایک بہت بڑی حقیقت دریافت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں کچھ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن آخرت کا دور ایک مختلف دور ہوگا۔ جو لوگ آخرت کے دور میں اس طرح داخل ہوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو وہاں کے تقاضوں کے مطابق تیار نہ کیا ہو تو وہ وہاں کامل طور پر بے جگہ ہو جائیں گے۔ ان کو آخرت کے دور حیات میں حسرت کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔

مثلاً جو لوگ برتری کی تقریر کرنے کے ماہر ہوں، وہ لوگ آخرت کی دنیا میں بے زبان (speechless) ہو جائیں گے۔ کیوں کہ وہاں صرف ایک ہی زبان کی قیمت ہوگی، اور وہ ہے تواضع (modesty) کی زبان۔ جو لوگ غیر خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں، وہ آخرت کے دور میں بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیوں کہ آخرت کے دور میں صرف ان لوگوں کو مقام ملے گا، جو خدا کی بڑائی میں جینے والے ہوں۔ جو لوگ نفرت (hate) کے الفاظ بولنے کے ماہر ہوں، وہ آخرت کے دور میں اپنی قیمت کھو دیں گے۔ کیوں کہ آخرت میں محبت انسانی کا کلچر ہوگا، نہ کہ نفرت انسانی کا کلچر۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج کی دنیا میں جو لوگ بڑے دکھائی دیتے ہیں، وہ کل آنے والی دنیا کے دور حیات میں آخری حد تک چھوٹے دکھائی دینے لگیں گے۔

دوڑ بے منزل

ہر آدمی بے تکان بول رہا ہے۔ ہر آدمی آخری حد تک اپنی ضرورتوں کو بڑھائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی لامحدود طور پر اپنی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ عیش اور راحت کی تمام چیزیں وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے اکھٹا کرلے۔ یہ مادّیت کی طرف مجنونانہ دوڑ ہے، مگر نتیجہ کیا نکل رہا ہے — ہر آدمی اِس احساس میں جیتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں۔ جو فُل فِل مینٹ وہ چاہتا تھا، وہ اس کو حاصل نہ کرسکا۔ ہر عورت اور مرد اِسی محرومی کے احساس میں جیتے ہیں۔ اِسی حال میں اُن کے رات اور دن گزرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی تمناؤں کا گھروندا حالات کے طوفان سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہے۔ اور اگر حالات اس کو نہ توڑیں تو موت ہر حال میں اپنے وقت پر آتی ہے اور ہر ایک کو مجبور کرتی ہے کہ وہ موت کے بے رحم فیصلے کو قبول کرے، جس طرح اس سے پہلے اِس دنیا میں آنے والے تمام لوگ موت کے فیصلے کو مجبورانہ طور پر قبول کر چکے ہیں۔

لوگ موت سے پہلے کی عارضی زندگی کا سامان درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل ضرورت یہ ہے کہ موت کے بعد کی ابدی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا جائے۔ موت سے پہلے کی زندگی، امتحان کی زندگی ہے۔ اِس بنا پر یہ خدا کی ذمے داری ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے وہ سامان فراہم کرے، جس کے ذریعے وہ اپنا امتحان دے سکے۔ مگر جہاں تک موت کے بعد کی زندگی کا معاملہ ہے، اس کی ذمے داری خدا نے نہیں لی ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں سارا معاملہ آدمی کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ موجودہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ کچھ نہ کرو، تب بھی تم کو ضرورت کا سامان یک طرفہ طور پر فراہم کیا جائے گا۔ مگر اگلی زندگی کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ اگلی زندگی کا اصول ہے بی جیسا بونا، ویسا کاٹنا۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ موجودہ زندگی کے لیے تو خوب دوڑ دھوپ کررہے ہیں، لیکن اگلی زندگی کے معاملے کو وہ سرتاسر بھولے ہوئے ہیں۔ موجودہ زندگی میں آج کی کمی، کل کے دن زیادہ عمل کرکے پوری کرلی جاتی ہے، لیکن اگلی زندگی میں کسی عورت اور مرد کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنے ماضی کی کمیوں کی دوبارہ تلافی کرسکے۔

آنے والا کل

قرآن کی سورہ القیامۃ کی ایک آیت یہ ہے: كَلَّا بَلْ تحبُّونَ الْعَاجِلَةَ ، وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (75:20-21) یعنی ہرگز نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ تم عاجلہ سے محبت کرتے ہو، اور تم آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو :

Nay, but you love the present life, and neglect the hereafter.

کوئی انسان جب پیدا ہو کر اس دنیا میں آتا ہے، تو وہ دیکھتا ہے کہ اِس دنیا میں ہر طرف اس کے لیے مختلف قسم کے مواقع (opportunities) موجود ہیں۔ وہ اِن مواقع کو استعمال کرنے کے لیے اُن کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے، ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی جانور ہری گھاس کو دیکھ کر اس کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اِن مواقع کے ذریعے وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرلے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے، جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ موجودہ دنیا کے مواقع اِس لیے نہیں ہیں کہ اُن کے ذریعے صرف وقتی قسم کے دنیوی فائدے حاصل کیے جائیں، بلکہ یہ مواقع اِس لیے ہیں، تاکہ انسان اُن کی مدد سے وہ اعلیٰ کام کرے، جو آخرت میں اُس کے لیے مفید بننے والا ہو۔ مثلاً کسی کے پاس مال ہے تو وہ اِس لیے نہیں ہے کہ وہ اُس کے ذریعے اپنی خواہشوں کو پورا کرے۔ وہ سماج کے اندر اپنے اسٹیٹس (status) کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ بلکہ مال کا صحیح مصرف یہ ہے کہ — بقدر ضرورت وہ اس کو اپنے پاس رکھے، اور بقیہ مال کو وہ خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ مثلاً دعوت الی اللہ کا کام۔

موجودہ دنیا عارضی ہے، اور بعد کو آنے والی دنیا ابدی۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ عارضی دنیا کی ترقی اور خوش حالی میں لگا دیتا ہے، لیکن آخرت کی ابدی زندگی کے معاملے کو وہ اِس طرح چھوڑے ہوئے ہوتا ہے، جیسے کہ وہ کبھی پیش آنے والا ہی نہیں۔ دانش مند وہ ہے جو آخرت کی فکر میں جیے، اور نادان وہ ہے جو آخرت کی فکر سے غافل ہو جائے۔

موت ایک یاددہانی

ایک دن میں اپنے معاصرین (contemporaries) کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ افراد جو میرے زمانے میں پیدا ہوئے، جن کے ساتھ میں نے زندگی کا سفر طے کیا، جن کے ساتھ میں زمین پر چلتا پھرتا رہا— مسٹر اے کو میں نے زندہ حالت میں دیکھا تھا، مگر آج وہ اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ مسٹر بی، مسٹر سی، مسٹر ڈی، مسٹر ای، سب کا یہی انجام ہو چکا ہے۔ اِس طرح میں اپنے جاننے والوں میں سے ایک ایک شخص کو یاد کرتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ سارے لوگ اب وفات پا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ پچھلے دنوں مجھے خبر ملی کہ مسٹر وائی کی بھی وفات ہوگئی۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میری زبان سے نکلا کہ میری باری بہت قریب آ گئی:

The countdown has reached the last but one number.

پھر میں نے سوچا کہ یہ معاملہ صرف میرا ذاتی معاملہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہی معاملہ ہر عورت اور مرد کا معاملہ ہے۔ ہر ایک روزانہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ مرتے جارہے ہیں۔ میڈیا کے ذریعہ ہر ایک، دور دور کے لوگوں کے بارے میں بھی اِسی طرح موت کی خبریں سنتا رہتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ کوئی شخص یہی بات خود اپنے بارے میں نہیں سوچتا۔ کوئی عورت یا مرد سنجیدگی کے ساتھ یہ غور نہیں کرتا کہ اِسی طرح میں خود بھی بہت جلد مرنے والا ہوں۔ وہ موت سے پہلے کی زندگی کے مسائل کے بارے میں تو ہر وقت سوچتا ہے، لیکن موت کے بعد کے مسائل کے بارے میں کوئی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جاننے کے باوجود نہ جاننے کے اِس عجیب ظاہرہ کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنے ڈی این اے (DNA) سے کنٹرول ہوتا ہے۔ آدمی اپنا ہر چھوٹا یا بڑا کام ڈی این اے کی رہ نمائی میں کرتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں تو ہر ایک کے ڈی این اے میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ مگر ایک بات کسی کے ڈی این اے میں سرے سے درج نہیں۔ اور وہ موت (death) کا معاملہ ہے۔

دارالعمل، دارالجزاء

دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزاء۔ یعنی دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت اس عمل کے مطابق بدلہ پانے کی جگہ۔ ہر عورت اور مرد اپنی زندگی کا ابتدائی بہت تھوڑا حصہ موجودہ دنیا میں گزارتے ہیں اور پھر موت کے بعد وہ اگلی دنیا میں پہنچا دیے جاتے ہیں جہاں ان کو اپنے عمل کے مطابق، یا جنت میں جگہ ملے گی یا جہنم میں۔

اس اعتبار سے موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ امتحان ہال ہمیشہ ٹسٹ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ ٹسٹ کا رزلٹ پانے کے لیے۔ جو طالب علم امتحان ہال میں جاب حاصل کرنا چاہے وہ یقینی طور پر ناکام رہے گا۔ اسی طرح جو شخص موجودہ دنیا میں اپنے لیے خوشیوں کا ابدی محل بنانا چاہے وہ بھی اپنے مقصود کو نہیں پائے گا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا اس مقصد کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔

عقلمند آدمی وہ ہے جو اس فرق کو سمجھے اور وہ دنیا میں وہ کرے جو اس کو یہاں کرنا ہے، اور آخرت کے لیے وہ چیز چاہے جو وہاں کسی خوش نصیب شخص کو ملنے والی ہے۔

اس معاملے میں عقلمند آدمی ٹھیک اسی اصول کو اختیار کرتا ہے جس کو طالب علم اختیار کرتا ہے۔ طالب علم جب امتحان ہال میں ہوتا ہے تو وہ اپنی ساری توجہ اس طرف لگا دیتا ہے کہ وہ اپنے ٹسٹ پیپر کو صحیح طور پر کر سکے وہ امتحان ہال میں اپنا معاشی محل بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

ٹھیک یہی حال ہر انسان کا دنیا اور آخرت کی نسبت سے ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ موت سے پہلے کی مختصر زندگی کو آخرت کی تیاری میں لگائے تا کہ موت کے بعد کے دورِ حیات میں وہ اپنے لیے خوشیوں کی دنیا پا سکے۔ اگر کوئی عورت یا مرد موجودہ دنیا میں اس اعتبار سے غافل رہے تو اگلی دنیا میں اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی، حتی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ لوٹ کر دوبارہ موجودہ دنیا میں آئے اور آخرت کی نسبت سے دوبارہ اپنی تعمیر کرے۔

انسان کی تخلیق

انسان کے مقصدِ تخلیق کے بارے میں قرآن میں مختلف آیتیں آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک آیت یہ ہے: اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ (23:115)۔ یعنی کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے بہترین صورت (غافر: 64) پر پیدا کیا ہے۔ انسان ساری کائنات میں ایک مکرم مخلوق (الاسراء: 70) کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے بہترین صلاحیتیں عطا کی ہیں (التین: 4)۔ انسان کو استثنائی طور پر عقل و بصیرت دی گئی (الانسان: 2) ہے جو کسی بھی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، ایک انتہائی بامعنی مخلوق ہے۔ انسان کی تخلیق میں ایک انتہائی ذہین ڈیزائن (intelligent design) پائی جاتی ہے۔ اِس تخلیق میں یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ انسان سے اس کے خالق کو اِس دنیا میں ایک مثبت کردار (positive role) مطلوب ہے مگر عجیب بات ہے کہ عام طور پر انسان اس کے برعکس منفی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ بلاشبہہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سوال ہے۔

اِس سوال کا جواب ایک حدیثِ رسول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے: اکثروا ذکر هادم اللذات الموت (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2307)۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان وقتی لذتوں میں گم ہو کر اُس اعلیٰ رول کو ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے جو اس کے لیے اس کی صلاحیت کے اعتبار سے مقدر کیا گیا ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے شعور کو بیدار کرے۔ وہ خالق کے اِس اشارے کو سمجھے کہ اگر میں نے خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اپنے آپ کو خدائی مشن سے لگایا جو کہ میری صلاحیتوں کا اصل استعمال ہے تو اس کے بعد میری زندگی کی تمام ضرورتوں کی اعلیٰ تکمیل خود خالق کی طرف سے کی جائے گی۔

رفیقِ اعلیٰ کی طرف

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قدیم شاہ مصر کی مومن بیوی آسیہ کے لیے جب بادشاہ نے موت کا حکم صادر کیا تو اس وقت ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (66:11) یعنی اے میرے رب، تو میرے لیے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنا دے۔ یہ عام مومن کے الفاظ میں کی ہوئی ایک دعا ہے۔ یہی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آخر وقت میں پیغمبرانہ انداز میں اِس طرح نکلی: اللھم الرفیق الأعلی (اے اللہ، رفیق اعلیٰ)۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر 4463

یہ دونوں دعائیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہم معنیٰ ہیں۔ پہلی دعا عام مومن کے الفاظ میں کی ہوئی دعا ہے، اور دوسری دعا پیغمبرانہ سطح پر ایک نبی کی زبان سے نکلی ہوئی دعا۔

یہ دونوں دعائیں دراصل موت کی نسبت سے مومنانہ جذبات کا اظہار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن پر جب موت کا لمحہ آئے تو اس کا احساس مذکورہ قسم کی دعامیں ڈھل جائے۔ اس وقت مومن کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ — جب اہلِ دنیا سے میرا ساتھ چھوٹے تو مجھے خداوندِ ذوالجلال کی قربت حاصل ہوجائے۔ مجھے انسانوں کی مجلس سے اٹھنا پڑے تو مجھے فرشتوں کی مجلس میں شامل ہونا نصیب ہوجائے۔ جب موت مجھے اپنے لوگوں سے منقطع کردے تو میں اکیلا نہ ہوجاؤں، بلکہ مجھے اعلیٰ تر مجلس میں خدا کی معیت کی نعمت حاصل ہوجائے۔ میرا سفرِ موت میرے لیے رفاقتِ ادنیٰ سے رفاقتِ اعلیٰ کی طرف سفر بن جائے۔ مذکورہ دعا کی حیثیت محض دعائیہ الفاظ کی نہیں ہے۔ وہ سچے مومن کی داخلی تڑپ کا لفظی اظہار ہے۔ ایک سچے مومن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ موجودہ مرحلۂ حیات کے مقابلے میں اگلا مرحلۂ حیات اس کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہو۔ موجودہ دارالامتحان میں اس کو خدا کی جو نعمتیں عارضی طور پر ملی ہوئی ہیں، وہ نعمتیں اس کو موت کے بعد کی دنیا میں زیادہ اعلیٰ طور پر خدا کے ابدی انعامات کی صورت میں عطا ہوجائیں۔ موت میرے لئے ناقص دنیا (imperfect world) سے نکل کر، کامل دنیا (perfect world) میں داخلے کا ذریعہ بن جائے۔

خوشی صرف آخرت میں

چارلی چپلن(Charlie Chaplin) ایک برٹش فلم اسٹار تھا۔ اس کی پیدائش 1889 میں ہوئی۔ اور 88 سال کی عمر میں 1977 میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک مزاحیہ اداکار (comedian) تھا۔ اس کا شو دیکھ کر لوگ بہت زیادہ ہنستے تھے۔ مگر خود چارلی چپلن اندر سے غم گین رہتا تھا۔ تمام مادّی سازوسامان کے باوجود، اس کو اپنی زندگی میں خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک نفسیاتی ڈاکٹر (psychiatrist) کے پاس ایک شخص آیا۔ اُس نے کہا کہ میں بہت زیادہ افسردہ رہتا ہوں، آپ مجھ کو کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ میں خوش رہ سکوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم چارلی چپلن کا شو دیکھا کرو۔ آنے والے نے کہا کہ میں ہی تو چارلی چپلن ہوں۔ میں دوسروں کو ہنساتا ہوں، لیکن میرا دل اندر سے روتا ہے۔

چارلی چپلن ایک کامیڈین (comedian) تھا، مگر جب موت کا وقت قریب آیا، تو وہ اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایک ٹریجڈین (tragidian) بن چکا تھا۔ وہ شخص جو دوسروں کو ہنساتا تھا، اس نے اپنی حالت پر ایک بار اِن الفاظ میں تبصرہ کیا کہ — میں بارش میں چلنا پسند کرتا ہوں، تا کہ کوئی میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے:

I always like to walk in the rain, so that no one can see me crying.

یہی اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کی کہانی ہے۔ لوگ مصنوعی طور پر ہنستے ہیں، لیکن اندر سے انھیں کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ لوگ مصنوعی طور پر اپنی کامیابی کے قصے بیان کرتے ہیں، لیکن اندر سے وہ شکست خوردہ نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کے لیے بھی خوشی اور راحت نہیں۔ خوشی اور راحت صرف آخرت میں ہے جو موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں صرف خدا پرست عورتوں اور مردوں کو حاصل ہوگی۔ بنانے والے نے موجودہ دنیا کو عمل کے لیے بنایا ہے۔ یہاں صرف عمل برائے مسرت (happiness) ممکن ہے، نہ کہ خود مسرت کا حصول۔

مسرت کی تلاش

1947 سے پہلے ہندستان میں برٹش راج تھا۔ وہ دو سو سال تک قائم رہا۔ اُس زمانے میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان تھے۔ وہ اُس وقت ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ بظاہر اُن کو تمام دُنیوی چیزیں ملی ہوئی تھیں۔

اُن کے یہاں تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ اُن کا نام انھوں نے فرحت اور راحت اور عشرت رکھا۔ اِس واقعے کو لے کر ایک شاعر نے اُن کے بارے میں یہ شعر کہا تھا:

فرحت وراحت وعشرت ہمہ فرماں بردار

مگر یہ صورت حال دیر تک قائم نہیں رہی۔ اگست 1947 میں ملک کی تقسیم ہوئی۔ اِس کے بعد ان کا خاندان بکھر گیا۔ وہ لوگ مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ یہ پریشانی پھر کبھی ختم نہ ہوسکی۔ خاندان کا ہر فرد مایوسی کا شکار ہو کر مر گیا۔

یہی اِس دنیا میں کم وبیش ہر عورت اور ہر مرد کا حال ہے۔ انسان ہر قسم کی خواہشوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کرکے کامل مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان اپنے آپ میں مجسم مسرت (pleasure incarnate) ہے۔

لیکن اِسی کے ساتھ دوسری سنگین حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اِس دنیا میں اپنی مسرتوں کی تکمیل نہیں کرپاتا۔ ہر شخص مسرت کی تلاش میں سرگرم رہتا ہے، لیکن ہر شخص مسرت کو حاصل کیے بغیر مرجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق نے انسان کو مسرت کا متلاشی بنایا، لیکن خالق نے موجودہ دنیا میں مسرت کے حصول کا موقع اُس کے لیے نہیں رکھا۔

انسان کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں خواہش (desire) کا تجربہ کرے، اور خواہشوں پر کنٹرول کرکے اس کی تکمیل (fulfillment) کے لیے وہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا کا انتظار کرے — اِسی دریافت کا نام کامیابی ہے، اور اِسی دریافت سے محرومی کا نام ناکامی۔

عقیدہ آخرت کی طاقت

قدیم عراق کا سلجوقی حکمراں ملک شاہ (وفات 1092ء) کا ایک واقعہ ہے۔ ایک دن ملک شاہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پل سے گزر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک بوڑھی عورت آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے لڑکے کو ملک شاہ کے کسی سپاہی نے بیگار کے طور پر پکڑ لیا تھا۔ بوڑھی عورت نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے فریاد کی اور کہا کہ تمھارا ایک سپاہی میرے لڑکے کو بلا وجہ پکڑ لے گیا ہے، سلطان نے کہا کہ تم دربار میں استغاثہ پیش کرو۔ بوڑھی عورت نے کہا کہ ملک شاہ! میرا فیصلہ تم کو اِسی وقت اور اِسی پل پر کرنا ہوگا، یا پھر کل اُس پل (پل صراط) پر فیصلہ ہوگا۔ بوڑھی عورت کی یہ بات سن کر سلطان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس نے اُسی وقت اس کی فریاد رسی کی۔ (مجلہ الشارق، اعظم گڑھ، مارچ، اپریل 2014)

آخرت کا عقیدہ بلا شبہ تمام دوسرے عقائد سے زیادہ بڑا انقلابی عقیدہ ہے۔ جس آدمی کو آخرت کی دریافت ہوجائے، وہ اِس عقیدے کی دریافت کے بعد ویسا نہیں رہے گا جیسا کہ وہ اِس عقیدے کی دریافت سے پہلے تھا۔ آخرت کی دریافت کا واقعہ اس کے لیے ایک بھونچال بن جائے گا۔ اِس دریافت کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کی سوچ بدل جائے گی، اس کا مزاج بدل جائے گا، اس کے بولنے کا انداز بدل جائے گا، لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک بدل جائے گا، غرض، زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے وہ ایک نیا انسان بن جائے گا۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ایک ایسا معاشرہ تیار کیا جائے، جس کے افراد آخرت کے عقیدے پر زندہ یقین رکھتے ہوں، تو ایسے معاشرے کے ہر فرد کے پاس ایک ایسی طاقت ہوگی جو بظاہر دکھائی نہیں دے گی، لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ ایک ناقابلِ تسخیر طاقت ہوگی۔ ایسے معاشرے میں کسی آدمی کو آخرت کی عدالت کی یاد دلانا اُس کے لیے گن اور بم سے زیادہ موثر ہوگا۔ آخرت کا عقیدہ ایک کمزور آدمی کو بھی سب سے بڑی طاقت کا مالک بنا دیتا ہے۔

کامیاب انسانوں کی ناکامی

عظیم ہاشم پریم جی (پیدائش: 1945) دنیا کے عظیم ترین صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ اُن کو ایک نہایت کامیاب انسان (super achiever) سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک بار کہا کہ — زندگی کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب آپ اس کو سمجھنے لگتے ہیں تو وہ ختم ہونے کے قریب ہوجاتی ہے۔

زندگی کے بارے میں اس قسم کا تاثر اکثر کامیاب لوگوں نے بیان کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی عمر محدود ہے، لیکن اس کی خواہشات (desires) لامحدود ہیں۔ آدمی پختگی کی عمر کو پہنچ کر جب اپنی زندگی شروع کرتا ہے تو اس کو طرح طرح کے تجربات پیش آتے ہیں، منفی تجربات بھی اور مثبت تجربات بھی۔ لرننگ (learning) کے مختلف احوال سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جب کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اب میں زیادہ بہتر طور پر اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرسکتا ہوں، عین اُس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بوڑھا ہوگیا یا میری موت کا وقت قریب آ گیا۔

اِس مرحلے میں پہنچ کر اس کا یقین (conviction) مایوسی (frustration) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی آخری منزل تک پہنچے بغیر میرا خاتمہ ہورہا ہے۔ اس احساس کو رابندرناتھ ٹیگور نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا — میری ساری عمر بینا (ستار) کے تاروں کو سلجھانے میں بیت گئی۔ جو اتم گیت میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

ہر انسان حوصلے کے ساتھ اپنی زندگی شروع کرتا ہے اور پھر مایوسی کے ساتھ وہ مرجاتا ہے۔ اِس المیہ کا سبب صرف ایک ہے — فانی دنیا میں اُس چیز کو پانے کی کوشش کرنا جو صرف آخرت کی ابدی دنیا میں ملنے والی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی شروع کرنے سے پہلے خالق کے تخلیقی نقشے کو جانے۔ اِس دنیا میں حقیقی کامیابی صرف اُس انسان کے لیے مقدر ہے جو خالق کے نقشے کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

لذتوں کو ڈھانے والی

موت کے بارے میں ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أكثروا ذكر هادم اللذات، يعني الموت (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر4258) یعنی موت کو یاد کرو جو لذتوں کو ڈھادینے والی ہے۔ موت ایک قسم کا شخصی زلزلہ ہے۔ جس طرح زلزلے کے مقابلے میں آدمی کو کوئی اختیار نہیں ہوتا، اسی طرح موت ایک ایسا یک طرفہ حملہ ہے جس کے مقابلے میں انسان کو مطلق کوئی اختیار نہیں۔ موت خود اپنے فیصلے کے تحت آتی ہے، آدمی کو لازماً اس کو اختیار کرنا پڑتا ہے، خواہ وہ اس کو چاہے یا نہ چاہے۔

سروے کے مطابق، آدمی کی اوسط عمر تقریباً ستر سال ہے۔ مزید یہ کہ کسی انسان کو یہ نہیں معلوم کہ کب اس کا آخری وقت آجائے گا۔ یہ احساس آدمی کے لیے ہر دنیوی لذت کو بے لذت بنا دیتا ہے۔ مال، سیاسی اقتدار، شہرت، وغیرہ ہر چیز اس کو بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی زندگی ایک ایسے انتظار کے ہم معنی بن جاتی ہے جس کے متعلق اس کو کچھ بھی نہیں معلوم کہ اس کا انتظار کس حد پر جا کر ختم ہوگا، وہ آج کہاں ہے اور کل وہ کس مقام پر ہوگا۔

یہ معاملہ معروف لذتوں تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ہر لذت تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً انسان کا یہ مزاج ہے کہ اگر اس کو کسی سے اختلاف پیدا ہوجائے تو وہ اس کی کردار کشی (character assassination) کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کی تصویر (image) کو بگاڑنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ برے انداز میں اس کا چرچا کرنا اس کو اچھا معلوم ہونے لگتا ہے، خواہ اس کی بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے بے بنیاد کیوں نہ ہو۔ یہ سب اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ موت سے غافل ہے۔ اگر اس کو موت کا زندہ یقین ہو تو وہ اس قسم کی منفی باتوں سے رک جائے گا۔ کیوں کہ وہ سوچے گا کہ موت آتے ہی اس کی منفی باتیں اتنا زیادہ بے وزن ہوجائیں گی کہ کوئی اس کو سننے والا بھی نہ ہوگا۔ حتی کہ اس کے اپنے الفاظ بھی اس کا اپنا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

تکاثر سے قبر تک

قرآن کی سورہ التکاثر میں انسان کی ایک عمومی حالت کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ○ حَتّٰی زُرْتُمُ المَقَابِرَ (102:1-2) ۔یعنی زیادہ سے زیادہ کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے۔ وہ اِسی عمل میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ دنیا سے اس احساس کے ساتھ چلا جاتا ہے کہ اس نے جس چیز کے حصول کو اپنا نشانہ بنایا تھا، اس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ مال برائے ضرورت کی ایک حد ہے۔ اِس کے برعکس مال برائے مال کی کوئی حد نہیں۔ اگر انسان ضرورت کے لئے مال حاصل کرنا چاہے تو ایک حد پر پہنچ کر اس کو اطمینان حاصل ہوجائے گا۔لیکن انسان اگر مال برائے مال کو اپنی زندگی کا نشانہ بنائے تو اس کی طلب کی کبھی کوئی حد نہیں آئے گی۔ انسان بے اطمینانی کی حالت میں جیے گا، اور بے اطمینانی کی حالت میں مرجائے گا۔

امریکا کے مشہور دولت مند بل گیٹس (Bill Gates) نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن گئے۔لیکن آخر میں ان کو محسوس ہوا کہ میری ضرورت تو محدود ہے۔ پھر اس کثیر دولت کا کیا استعمال۔ انھوں نے اپنے ایک لکچر میں کہا کہ:

Once you get beyond a million dollars, it is the same hamburger.

یعنی تم خواہ کتنی ہی زیادہ دولت حاصل کرلو، مگر تمھاری ضرورت تو بدستور وہی سینڈوچ رہے گی۔ یہ ہر اُس آدمی کا انجام ہوتا ہے، جو زیادہ دولت کمانے کو اپنا نشانہ بنائے۔ آخر میں عدم اطمینان کے سوا کچھ اور اُس کے حصے میں آنے والا نہیں۔

آخر میں قبر

قرآن کی سورہ التکاثر میں انسان کے لئے ایک نہایت نصیحت کی بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ انسان ساری کوشش کر کے دولت کا ڈھیر اکٹھا کرتا ہے مگر آخر میں اس کے اپنے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف قبر کا گڑھا ہے (102:1-2)۔ یہ تبصرہ انسان کی پوری تاریخ پر درست ثابت ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ وہ بظاہر بہت زیادہ حاصل کرتا ہے، لیکن عملاً اس کے اپنے حصہ میں بہت تھوڑا آتا ہے۔

اس معاملہ کی ایک عبرت انگیز مثال یہ ہے کہ امریکا کے مشہور دولت مند بل گیٹس (Bill Gates) نے اتنا زیادہ کمایا کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند انسان بن گئے، لیکن آخر میں ان کو محسوس ہوا کہ یہ ساری دولت صرف ایک خارجی ڈھیر ہے۔ اُن کے اپنے لئے ایک "سینڈ وچ" کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

> I can understand wanting to have a million dollars... but once you get beyond that, I have to tell you, it's the same hamburger.

ایک شخص کتنا ہی بڑا محل بنائے، اس کے اپنے حصہ میں محل کا صرف ایک کمرہ آتا ہے۔ کوئی بادشاہ کتنی ہی بڑی سلطنت قائم کرے اس کے بیٹھنے کے لئے صرف ایک تخت ہوتا ہے۔ کوئی شخص عالمی شہرت کا مالک بن جائے لیکن عملاً اس کے رہنے کے لئے ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی ہے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ آدمی جنت کو اپنی منزل بنائے نہ کہ دنیا کی کسی چیز کو۔

دنیا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان کا آخری مقام صرف قبر نظر آتا ہے، لیکن آخرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان کے لئے کامیابی کی ایک ایسی دنیا کھلی ہوئی ہے، جس کی کوئی حد نہیں۔ عقل مند وہ ہے جو دنیا سے بقدر ضرورت لے، اور اپنے حوصلوں اور تمناؤں کا نشانہ آخرت کو بنائے۔ یہی کسی انسان کے لئے حقیقت پسندی بھی ہے اور دانش مندی بھی۔

لازمی تجربہ

قرآن کی کئی آیتوں میں موت کا ذکر ہے۔ ایک آیت یہ ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ (29:57)۔ یعنی ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے:

Every soul will taste death and then to Us you shall return.

موت ہر آدمی کے لیے ایک لازمی تجربہ ہے۔ موت کیا ہے؟ موت، آدمی اور اس کی بنائی ہوئی دنیا کے درمیان کامل انقطاع (total detachment) کر دینے والی ہے، ایک ایسا انقطاع جس کے بعد انسان کے لیے اپنی دنیا کی طرف دوبارہ لوٹنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ موت کے واقعہ کا ایک ایسا پہلو ہے جو ہر عورت اور مرد کو ہلا دینے والا ہے۔ انسان کی اوسط عمر تقریباً ستر سال ہے۔ ہر آدمی عملاً اپنی عمر کا صرف ایک استعمال کرتا ہے، اور وہ ہے اپنے لیے یہاں ایک دنیا بنانا۔ مگر موت ایک لمحہ کے اندر آدمی کو اس کی بنائی ہوئی دنیا سے جدا کر دیتی ہے۔

موت ہر آدمی کے لیے ایک جبری یاددہانی (compulsory reminder) ہے، اس بات کی یاددہانی کہ انسان کی منزل (destination) کوئی اور ہے۔ موجودہ دنیا سے اس کا جبری انخلاء (compulsory eviction) ہونے والا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے خالق کی طرف لوٹایا جائے گا، وہ جہاں سے آیا تھا وہیں وہ دوبارہ چلا جائے گا۔

قرآن اسی حتمی واقعہ (fatal event) کو یاد دلانے والی کتاب ہے، کچھ آیتوں میں براہِ راست طور پر، تو کچھ آیتوں میں بالواسطہ طور پر۔ قرآن کا پیغام یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس حتمی واقعہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ یہاں تک کہ تمھاری سوچ موت رخی سوچ بن جائے، نہ کہ حیات رخی سوچ۔ تم قبل ازموت دور (pre-deathperiod) میں بعدازموت دور (post-death period) کے لیے تیاری کو اپنا مقصد حیات بنالو۔ قرآن سے اسی مسلسل تعلق کو حدیث میں تعاہد کہا گیا ہے۔

موت کی خبر

روزانہ اخبارات میں جو خبریں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک مستقل خبر وہ ہے جس کو موت کا کالم (obituary) کہا جاتا ہے۔ یہ خوش حال گھرانوں کی موت کے واقعات ہیں۔ مرنے والے کی تصویر کے ساتھ اس کی موت کی خبر ہوتی ہے اور پھر بتایا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر ان کی آخری رسوم ادا ہوں گی، دوست اور رشتہ دار وہاں آ کر متوفی کی آخری رسوم میں شرکت کریں۔

15 ستمبر 1990 کے اخبار سے دو مثالیں لیجئے۔ آج ٹائمس آف انڈیا کے آخری صفحہ پر اسی قسم کی ایک باتصویر خبر ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں رمیش گوئل، ایک بہترین آدمی بالکل جوانی کی عمر میں اچانک امریکا میں انتقال کر گئے:

Ramesh Goel, a good man has died suddenly at a very young age in U.S.A.

ہندستان ٹائمس کے صفحہ 4 پر ایک باتصویر خبر اس طرح چھپی ہے گہرے رنج اور افسوس کے ساتھ ہم مطلع کرتے ہیں کہ ہمارے محبوب پی ایس پاتھیجا کا 9 ستمبر کو ایک کار حادثہ میں اچانک اور بے وقت انتقال ہو گیا:

With profound grief and sorrow we inform the sudden and untimely demise of our beloved P.S. Patheja in a car accident on September 9, 1990

موت ہماری دنیا کا ایک عام واقعہ ہے۔ کسی شخص کی موت کے بعد اس کے ورثاء یا اس کہ جاننے والے اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ قومی رواج کے مطابق اس کی آخری رسوم ادا کر دیں۔ ہندو اپنے رواج کے مطابق، اور مسلمان اور دوسری قومیں اپنے رواج کے مطابق۔

مگر صرف اتنا کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی موت خود اپنے لیے موت کی خبر ہے۔ موت کا اصل فائدہ یہ ہے کہ مرنے والے کی موت کو دیکھ زندہ رہنے والے اپنے مرنے کو یاد کریں۔ وہ دوسرے کے انجام میں خود اپنے انجام کو دیکھ لیں۔ موت سے نصیحت لینا سب سے بڑا کام ہے، مگر یہی وہ کام ہے جس کو کرنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں۔

احتساب یا استقبال

ایکسپریس ٹرین تیزی سے دہلی کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ گھڑی بتارہی تھی کہ اسٹیشن اب قریب آگیا ہے۔ فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک عورت اپنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں بیٹی کے درمیان طرح طرح کی تفریحی باتیں جاری تھیں۔ اتنے میں بچی نے اپنی مخصوص زبان میں اپنی ماں سے کہا: ممی نانی کا گھر کب آئے گا۔

بے خبر بچی صرف اپنی نانی کو جانتی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ''نانی کے گھر'' جارہی ہے۔ مگر یہ اس کی سادگی تھی۔ کیوں کہ بچّی اور دوسرے تمام مسافر حقیقۃً ''خدا کے گھر'' کی طرف جارہے تھے۔ دہلی ان کا درمیانی اسٹیشن تھا نہ کہ آخری اسٹیشن۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو اسکو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ انسانی ٹرین پر نہیں ہے، بلکہ وہ خدائی سواری پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس سواری کو کھینچنے والا کو دخانی یا کہربائی انجن نہیں، بلکہ یہ خدا کے فرشتے ہیں جو اس کو دنیا سے آخرت کی طرف لے جارہے ہیں۔

مسافروں میں اگر یہ احساس زندہ ہو تو ان کا حال کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد جب وہ وقت آئے گا کہ ٹرین دہلی کے اسٹیشن پر رکے تو ناسمجھ بچی کے لیے اگر چہ وہ ''نانی کا گھر'' ہوگا جہاں اس کی نانی اس کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود ہوگی۔ مگر سچے مسافر کے لیے وہ خدا کا گھر ہوگا جہاں خدا کے فرشتے ہر آنے والے کو اپنے قبضہ میں لے رہے ہوں گے۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی چھوٹی ناسمجھ بچی کی طرح بنا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ''نانی کے گھر'' جارہا ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ''خدا کے گھر'' کی طرف جارہا ہے۔ وہ استقبال کے اسٹیشن پر نہیں بلکہ احتساب کے اسٹیشن پر اترنے والا ہے۔ کتنا زیادہ فرق ہے لوگوں کی سوچ میں اور اصل حقیقتِ واقعہ میں۔ لوگ اپنے ''اسٹیشن'' پر استقبال کرنے والوں کی بھیڑ دیکھ رہے ہیں۔ حالاں کہ صحیح بات یہ تھی کہ انھیں اسٹیشن کے اوپر احتساب کرنے والے فرشتوں کا ہجوم نظر آنے لگے۔

بے خبری کی تمام قسموں میں یہ بے خبری سب سے زیادہ عجیب ہے۔

موت کے بعد

ایک روایت کے مطابق، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذامات أحدُ کم، فقد قامتْ قیامتُه (کنز العمال، حدیث نمبر 42123) یعنی جب کسی شخص کی موت آتی ہے تو موت کے بعد ہی اس کی قیامت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت خاتمۂ حیات نہیں، بلکہ موت ایک دورِ حیات سے نکل کر دوسرے دورِ حیات میں داخلہ ہے۔ ایک دور اور دوسرے دور میں کوئی فاصلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک تسلسل (continuity) کا نام ہے، موت کا معاملہ صرف منتقلی (transfer) کا ایک معاملہ ہے، یعنی آدمی ایک عالَم سے نکل کر دوسرے عالَم میں پہنچ گیا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا تعمیرِ شخصیت (personality building) کا مقام ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنی شخصیت کی تعمیر کر رہا ہے۔ یہ شخصیت سازی دو طرح کی ہوتی ہے۔ مثبت شخصیت یا منفی شخصیت۔ جو لوگ اس دنیا میں مثبت شخصیت بنائیں گے، وہ موت کے فوراً بعد اپنے آپ کو جنت کے باغوں میں پائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے اندر منفی شخصیت بنائیں گے، ان کو موت کے بعد جہنم میں جگہ ملے گی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: إنما القبرُ روضةٌ من ریاضِ الجنةِ أو حفرةٌ من حفرِ النارِ. (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2460)۔ یہ حدیث اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ ایک اور حدیث کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إنما هي أعمالكم تردُّ إليكم (حلیۃ الاولیاء: 5/125) یعنی یہ ہر انسان کے اعمال ہیں جو آخرت میں اس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔ انسان اور اس کے عمل کے درمیان کوئی دوری نہیں ہوتی۔ جہاں انسان ہے وہیں اس کے اعمال بھی موجود ہوتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں انسان کے اعمال بظاہر دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن موت کے بعد فوراً وہ ظاہر ہو جائیں گے۔ انسان اپنے آپ کو اچانک اپنے اعمال کے درمیان پائے گا۔ اچھا عمل کرنے والا، اپنے آپ کو اچھے اعمال کے درمیان پائے گا، اور برا عمل کرنے والا اپنے آپ کو برے اعمال کے درمیان پائے گا۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

25 جولائی 2005 کا واقعہ ہے۔ صبح کے وقت میں دہلی میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر میں نے اپنا ریڈیو کھولا تو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے صبح کے نشریہ میں ایک گیت سنائی دینے لگا۔ اس کی ایک لائن یہ تھی:

سجن رے جھوٹ مت بولو خدا کے پاس جانا ہے — نہ ہاتھی ہے نہ گھوڑا ہے وہاں پیدل ہی جانا ہے

اس تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ریڈیو کا گیت اور چڑیوں کا نغمہ دونوں ایک ہیں۔ گویا کہ ریڈیو اسی حقیقت کا اعلان ملفوظ زبان میں کر رہا ہے جس کا اعلان اس سے پہلے چڑیاں غیر ملفوظ زبان میں کر رہی تھیں۔ دونوں کا پیغام ایک ہے — اے انسان، تو جس دنیا میں ہے، وہ خدا کی دنیا ہے۔ تیری کامیابی کا راز یہ ہے کہ تو اس بنیادی حقیقت کو جانے اور اپنی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق ڈھال لے۔

زندگی امتحان کی ایک مدت ہے اور موت اس مدت امتحان کا خاتمہ۔ موت گویا مالک کائنات کی طرف سے انسان کی گرفتاری ہے۔ موت کے بعد ہر عورت اور مرد خدا کی عدالت میں پہنچا دیے جاتے ہیں تاکہ وہ وہاں اپنے قول وعمل کا حساب دیں۔ اسی حساب کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ خدا کے حکم پر چلنے والوں کے لیے جنت کا فیصلہ، اور خدا کے حکم کے خلاف چلنے والوں کے لیے جہنم کا فیصلہ۔

لوگ ہر سال اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک اور سال پورا ہو گیا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ ہر سال اپنا ڈِتھ ڈے منائیں۔ وہ ہر سال یاد کریں کہ ان کی مقرر زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا۔ اس دنیا میں ہر عورت اور مرد ایک محدود مدت کے لیے آتے ہیں — پچاس سال، نوّے سال، بہت سے بہت سو سال۔ اس کے بعد ہر ایک کے لیے مقدر ہے کہ وہ اپنی عمر کی طے شدہ مدت پوری کر کے مر جائے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ہر عورت اور ہر مرد کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ ہر

نیا سال جب آتا ہے تو وہ ہر عورت اور ہر مرد کی عمر کا ایک سال اور کم کر دیتا ہے۔

موت ایک ایسا آنے والا واقعہ ہے جو ہر ایک پر آتا ہے۔ موت ایک چیتاونی ہے، وہ یاد دلاتی ہے کہ آخر کار ہر عورت اور مرد کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ خدا کی عدالت میں حاضری کی مدت بہت قریب ہے۔ موت ہر ایک کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اے سونے والو، جاگ اٹھو، اور اے جاگنے والو، ہوشیار ہو جاؤ۔ تم جلد ہی خدا کی کائناتی عدالت میں حاضر کئے جانے والے ہو۔ اس آنے والے بڑے دن کی تیاری کرو۔

ہر صبح کو جب آسمان پر سورج طلوع ہوتا ہے تو گویا کہ خدا اپنی کائناتی ٹارچ کو جلا کر انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ خدا ہر عورت اور ہر مرد کو دیکھ رہا ہے۔ بولنے والوں نے کیا بولا اور چلنے والے کس راہ پر چلے، کسی عورت یا مرد کو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس نے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ ہر چیز سے خدا پوری طرح آگاہ ہے۔ یہ صورت حال پکار کر ہر عورت اور ہر مرد سے کہہ رہی ہے کہ تم جب سوچو تو یہ دھیان میں رکھ کر سوچو کہ خدا تمہاری سوچ تک کو جانتا ہے۔ جب تم بولو تو یہ سوچ کر بولو کہ تمہارے الفاظ دوسرے انسان تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ جب تم کوئی کام کرو تو یہ سمجھ کر کرو کہ تمہارا ہر کام خدا کی نظر میں ہے اور ہر کام پر تم کو خدا کی طرف سے سزا یا انعام ملنے والا ہے۔

ہر پیدا ہونے والی عورت اور ہر پیدا ہونے والے مرد پر لازم ہے کہ وہ خدا رخی زندگی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ وقتی خواہشوں سے بلند ہو اور وہ روش اختیار کرے جو اس کے ابدی مستقبل کے لیے کارآمد ہو۔

ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو پہچانے۔ وہ خدا کی خدائی کا اقرار کرے۔ وہ خدا کے آگے پوری طرح جھک جائے۔ وہ خدا کا کامل پرستار بنے۔ وہ اپنے دماغ کو برے خیالات سے پاک کرے۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ بنے نہ کہ بدخواہ۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرے۔ وہ ایسے مال کو اپنے لیے حرام سمجھے جو جائز طور پر اس کا حق نہیں۔ اس کو کوئی عہدہ ملے تو اس عہدہ کو وہ ایک ذمہ داری سمجھے نہ کہ ایک اعزاز۔ وہ نفرت اور تشدد سے پوری طرح اپنے آپ کو

بچائے۔ وہ حسد اور بغض اور کینہ کو اپنے لیے ہلاکت سمجھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ وہ اپنے سماج کا ایک پرامن شہری بنے۔ وہ دوسروں کی مدد کرنے والا ہو۔ وہ جب بھی بولے اور جب بھی کوئی کام کرے تو یہ سوچ کر بولے یا کرے کہ اس کا یہ عمل خدا کی پسند کے مطابق ہے یا خدا کی پسند کے خلاف۔ اس کا ضمیر جس کام کو خدا کی پسند کا کام بتائے اس کو وہ اپنا لے اور جس کام کو اس کا ضمیر خدا کی پسند کے خلاف بتائے اس سے وہ اسی طرح بچے جس طرح کوئی شخص آگ سے بچتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور ہر مرد کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک جہنم کا راستہ اور دوسرا جنت کا راستہ۔ جو آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے وہ گویا جہنم کی طرف جا رہا ہے اور جو آدمی خدا کے حکم اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں چلے وہ جنت کی طرف جا رہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ وقتی فائدے کے بجائے ابدی فائدے کو سامنے رکھے اور وقتی مفاد کے بجائے ابدی کامیابی کے لیے عمل کرے۔ ہر عورت اور ہر مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کو جانے تاکہ اس کے مطابق وہ اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی کر سکے۔ تاکہ وہ بھٹکے بغیر اپنی حقیقی منزل تک پہنچ جائے۔

انسانی زندگی کی مثال آئس برگ جیسی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ (ٹپ) آج کی دنیا میں دکھائی دیتا ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کو پیدا کرنے والے نے انسان کو ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور پھر اس کی عمر کے بہت چھوٹے حصہ کو موجودہ دنیا میں رکھا اور اس کے بڑے حصہ کو اگلی دنیا میں رکھ دیا۔ اور پھر اس کے لیے مقدر کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کے امتحانی حصہ کو موجودہ مختصر دنیا میں گزارے اور اپنی بقیہ طویل عمر گزارنے کے لیے موت کے بعد اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے۔

موجودہ دنیا کیا ہے اور اگلی دنیا کیا۔ موجودہ دنیا ناقص دنیا ہے اور اگلی دنیا کامل دنیا۔ موجودہ دنیا انسان کے لیے ٹسٹ کی جگہ ہے اور اگلی دنیا ٹسٹ میں پورا اترنے کی صورت میں انعام پانے کی جگہ۔ اگلی دنیا میں خدا نے ایک معیاری دنیا بنائی اسی کا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا اس معیاری دنیا کا ایک ناقص نمونہ ہے۔ جنت آج کی ناقص دنیا کی ایک زیادہ کامل صورت ہے۔ جنت ایک ابدی دنیا

ہے جب کہ موجودہ دنیا صرف ایک فانی دنیا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ لوگ چنے جا رہے ہیں جو اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ جنت کی اعلیٰ دنیا میں بسائے جانے کے اہل ہیں۔ سلکشن (selection) کی یہ مدت جب پوری ہوگی تو منتخب افراد جنت کی معیاری دنیا میں پہنچا دئے جائیں گے، جہاں نہ کوئی تکلیف ہے اور نہ کوئی اندیشہ، جہاں نہ کوئی شور ہے اور نہ کوئی مصیبت۔ اور جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں انہیں کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے گا۔

آج کی دنیا میں لوگوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر عورت اور ہر مرد بے اطمینانی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کو بظاہر دنیا کے سارے سامان حاصل ہیں، وہ بھی مطمئن نہیں۔ اس بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیاری دنیا(ideal world) کا طالب ہے جب کہ موجودہ دنیا اپنے سارے ساز وسامان کے باوجود ایک غیر معیاری دنیا ہے۔ انسان کی طلب اور موجودہ دنیا کے درمیان یہی فرق بے اطمینانی کا اصل سبب ہے۔

جنت میں یہ فرق ختم ہوجائے گا۔ وہاں کی جنت عین وہی معیاری دنیا ہوگی جس کی طلب انسان اپنے اندر فطری طور پر پاتا ہے۔ جنت میں ہر عورت اور ہر مرد کو پورا فل فلمنٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ وہاں ہر ایک اپنی طلب کے مکمل جواب کو پالے گا۔

یہی وہ جنت کی معیاری دنیا ہے جس کے بارے میں پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا (لا عین رأت، و لا أذن سمعت، و لا خطر علی قلب بشر) صحیح البخاری، حدیث نمبر 3244۔

انسان کو اس کی ابدی عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل مسئلہ دنیا کی کامیابی یا دنیا کی ناکامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگلی دنیا میں جہنم کی سزا سے بچے اور اپنے آپ کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنائے۔ ایسی حالت میں انسان کو چاہیے کہ وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرے، اور وہ جنت کا سب سے زیادہ خواہش مند بنے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی حقیقت پسندی کا تقاضا بھی۔

پہلی زندگی، دوسری زندگی

انسان جب پیدا ہو کر موجودہ دنیا میں آتا ہے تو یہ اس کی پہلی زندگی ہوتی ہے۔ یہاں اُس کی طلب کے بغیر اس کے لیے سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ یہاں وہ پاتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کو ایک پُرمحبت خاندان مل گیا۔ اُس کو ایک ایسی دنیا مل گئی جو انتہائی حد تک اس کے لیے ایک موافق دنیا تھی۔ اس کو ایک مکمل قسم کا لائف سپورٹ سسٹم (life support system) حاصل ہو گیا جس کے بغیر اس کے لیے زندگی ممکن نہ ہوتی۔ یہ ساری چیزیں اُس کو یک طرفہ طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ خواہ وہ اُس کو شعوری طور پر محسوس کرے، یا وہ اس کو شعوری طور پر محسوس نہ کرے۔

اِس طرح ایک محدود مدت گزارنے کے بعد آدمی مرجاتا ہے۔ موت کا یہ واقعہ اس کے لیے ایک نئے سفر کا معاملہ ہوتا ہے۔ موت کے بعد آدمی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، جہاں دوبارہ وہ اکیلا ہوتا ہے۔ اب بھی وہ پہلے کی طرح ایک زندہ اور حسّاس وجود ہوتا ہے، لیکن پچھلی دنیا میں ملی ہوئی تمام چیزیں اُس سے چھوٹ جاتی ہیں۔ اب وہ پھر اِس کا محتاج ہوتا ہے کہ دوبارہ اس کو تمام چیزیں ازسرِ نو حاصل ہو جائیں، تاکہ وہ عافیت اور سکون کی زندگی گزار سکے۔

انسان کو پہلی زندگی کا تجربہ اِس لیے کرایا جاتا ہے کہ اُس کے دل سے یہ دعاء نکلے — اے میرے رب، تو نے جس طرح پہلی زندگی میں میری ضرورت کی تمام چیزیں کسی استحقاق کے بغیر مجھے دے دی تھیں، اُسی طرح دوسری زندگی میں بھی تو مجھے میری ضرورت کی تمام چیزیں مزید اضافے کے ساتھ دے دے۔ پہلی زندگی میں میں نے تیرے عطیات کا جو ابتدائی تجربہ کیا تھا، دوسری زندگی میں تو اُس کو انتہائی صورت میں میرے لیے مقدر کردے۔ پہلی زندگی میں تو نے جو کچھ مجھے دیا، وہ بھی غیر مستحق ہونے کے باوجود مجھے دیا تھا، دوسری زندگی میں بھی تو غیر مستحق ہونے کے باوجود تمام چیزیں مجھ کو عطا کردے۔ پہلی زندگی میرے لیے تیری نعمتوں کا آغاز تھا، دوسری زندگی میں تو میرے لیے اِن نعمتوں کا اِتمام فرمادے۔

فرسٹ، سکنڈ

رابرٹ ہومز (Robert Holmes Court) آسٹریلیا کا ایک تاجر تھا۔ اس نے 1962 میں مغربی آسٹریلیا میں ایک ادنی مل سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ وہ تیزی سے ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ایک اقتصادی سلطنت (financial empire) بنالی۔ اس کی دولت ایک بلین ڈالر سے زیادہ ($1.1 bilion) تک پہنچ گئی۔ 1987 سے اس کو زوال شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی آدھی دولت کھودی۔ ستمبر 1990 میں اس کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ پرتھ (Perth) کے پاس اپنے ہارس فارم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ بوقت وفات اس کی عمر 53 سال تھی۔ ٹائم (17 ستمبر 1990) نے اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک وقت وہ ملک کا فرسٹ دولت مند شخص سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب وہ مرا تو وہ اپنے ملک کا سکنڈ دولت مند شخص تھا جس کی دولت گھٹ کر 650 ملین ڈالر ہو گئی تھی:

> Once the country's wealthiest man, he died the second richest (after fellow entrepreneur Kerry Packer), with an estimated fortune of $650 million.

اِس دنیا میں ہر آدمی کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ یہاں ہر آدمی موت سے پہلے "فرسٹ" بنا رہتا ہے۔ مگر موت ہر آدمی کو "سکنڈ" بنا دیتی ہے۔ موت سے پہلے آدمی سمجھتا ہے کہ یہاں صرف میں ہوں، میرے سوا یہاں کوئی دوسرا نہیں۔ مگر موت آدمی کو بتاتی ہے کہ یہاں حقیقی وجود صرف خدا کا ہے، کسی "میں" کی یہاں کوئی حقیقی حیثیت نہیں۔

موت ہر آدمی کے لیے بے رحم معلّم ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اُس حقیقت کو خود جان لے جو بے رحم معلم کے ذریعہ اسے بتائی جانے والی ہے۔ خود جاننے والا شخص اللہ تعالی کے یہاں بینا قرار پائے گا۔ اور جو شخص اس بات کو بے رحم معلّم کے ذریعہ جانے، وہ اندھا ہے۔ اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اندھا بن کر ابد تک اندھیری وادیوں میں بھٹکتا رہے۔ اور کبھی ان سے نکلنے کا راستہ نہ پائے — کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب ایک مسٹر فرسٹ اپنے آپ کو مسٹر سکنڈ کے مقام پر کھڑا ہوا پائے۔

جس خوشی کی ہمیں تلاش ہے

ایک بار میں راجستھان کے ایک مقام پر گیا۔ یہ سفر مولانا محمد تقی امینی (وفات 1991) کے ساتھ ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک صاحب سے ملے۔ وہ آبادی سے باہر ایک فارم ہاؤس میں رہتے تھے۔ اُن کو اپنے والد سے کافی مال وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے اپنی پسند کی ایک خاتون سے شادی کی، اور دونوں اس فارم ہاؤس میں رہنے لگے۔ بظاہر یہ فارم ہاؤس ایک خوب صورت دنیا کا منظر پیش کر رہا تھا، لیکن اُس کے اندر جو عورت اور مرد رہ رہے تھے، وہ کامل افسردگی کی تصویر تھے۔

اِن دونوں نے اپنی پسند کی شادی کی، اور پھر اِس فارم ہاؤس کے اندر ایک پُر مسرت اِزدواجی زندگی گزارنے لگے۔ کچھ سالوں تک دونوں بہت خوش تھے۔ اُس کے بعد دونوں، فارم ہاؤس کی اِس زندگی سے اکتا گیے۔ میں اور مولانا محمد تقی امینی اُس گھر میں ایک رات اور ایک دن ٹھہرے۔ اِس مدتِ قیام میں میں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا کہ وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ یہ فارم ہاؤس جو کبھی خوشیوں کا گہوارہ معلوم ہوتا ہوگا، اب وہ افسردگی کا ایک قبرستان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں اِس طرح کے بہت سے لوگ دیکھے ہیں، مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلموں میں بھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہایت محنت سے مال کمایا، لیکن جب مال اُنھیں حاصل ہو گیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ مال میں اُن کے لیے کوئی خوشی نہیں۔

کسی نے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اپنی پسند کی شادی کی، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ شادی اُن کے لیے صرف ایک خشک ذمے داری ہے، نہ کہ خوشیوں کی پُر مسرت زندگی۔ کسی نے اپنی پوری زندگی کو سیاست میں وقف کیا، تاکہ وہ سیاسی اقتدار کی کرسی پر پہنچ سکے، لیکن جب سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو اُس کے لیے خوشیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کسی کا نشانہ یہ تھا کہ اُس کے پاس ایک کشادہ اور خوب صورت مکان ہو، لیکن مکان جب بن کر تیار ہو گیا تو اس کے

چہرے سے خوشی رخصت ہو چکی تھی، وغیرہ۔

موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ الم ناک پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے المیہ (tragedy) کے سوا اور کچھ نہیں۔ بڑے بڑے ادیبوں نے ہر زبان میں لاکھوں کی تعداد میں ناول لکھے ہیں۔ یہ ناول گویا انسانی جذبات کی ترجمانی کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان میں کوئی طربیہ (comedy) ناول کبھی زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ دنیا میں جتنے بھی مقبول ناول ہیں، وہ سب کے سب المیہ (tragedy) ہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ ہر انسان اِس احساس میں جی رہا ہے کہ وہ جس خوشی کو پانا چاہتا تھا، وہ اس کو حاصل نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ ناول انسان کے دل کو چھوتے ہیں، طربیہ ناول انسان کے مائنڈ کو ایڈریس نہیں کرتے۔

یہ انسانی زندگی کا بڑا عجیب پہلو ہے کہ ہر انسان کی عمر کا پہلا نصف حصہ خوشی کی تلاش میں گزرتا ہے، اور بقیہ نصف حصہ اِس احساس میں کہ بظاہر خوشیوں کے سامان حاصل کرنے کے باوجود میں اپنے لیے خوشیوں کی مطلوب دنیا نہ بنا سکا۔

تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اِس لیے نہیں ہے کہ وہ یہاں اپنے لیے خوشیوں کی ایک دنیا بنائے۔ موجودہ زندگی صرف اس لیے ہے کہ آدمی حسنِ عمل سے اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ وہ موت کے بعد کی ابدی زندگی میں خوشیوں کی مطلوب دنیا پا سکے۔ موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات، اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنانے کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلۂ حیات حسب استحقاق جنت میں داخلے کا مرحلہ، یعنی خوشیوں کی اُس دنیا میں داخلے کا مرحلہ، جس کو ہر آدمی کی روح تلاش کر رہی ہے۔

انسان کی منزل صرف خدا ہے اس سے کمتر
کوئی چیز انسان کی منزل نہیں بن سکتی

تکمیلِ آرزو

مشہور آرٹسٹ فدا حسین (1915-2011ء) اگرچہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے مگر اپنی محنت اور فطری لیاقت کے ذریعہ انھوں نے مصوری کے فن میں غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ ان کی شہرت سب سے زیادہ اس وقت بڑھی جب ممبئی کے تاج محل ہوٹل میں ایک نمائش کے دوران ایک بیرونی کمپنی نے ان کی ایک تصویر پانچ لاکھ روپیہ میں خریدی۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے عظیم ترین مصور کہے جانے لگے۔

ٹائمس آف انڈیا (6 اکتوبر 1990) میں ان سے ملاقات کی ایک روداد شائع ہوئی ہے۔ مسٹر پال نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی چیز ہے جس سے آپ خوفزدہ ہوں۔ 75 سالہ فدا حسین نے جواب دیا کہ نہیں۔ مگر کبھی کبھی مجھے عجیب قسم کی مایوسی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ عین اس وقت جب کہ مجھے پینٹنگ میں کچھ درک حاصل ہوا، جب میں اس کے رازوں کو جاننے لگا تو میرے لیے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ ابھی بہت سی چیزیں ہیں جن کو مجھے پینٹ کرنا ہے۔ اب بھی میں خیالات سے بھرا ہوا ہوں:

> At times, there is a strange sadness though. That just when I have got a grip over painting, when I have begun to grasp its mystery, it is time to pack up. There is so much I can still paint. I am still so full.

یہی اس دنیا میں ہر انسان کا معاملہ ہے۔ آدمی بے پناہ آرزوؤں اور حوصلوں کو لے کر دنیا میں آتا ہے۔ وہ رات دن محنت کرتا ہے مگر اس کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہوتی کہ موت کا وقت آجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک غیر تکمیل شدہ حوصلوں کا ایک مزار ہے۔ یہ اس بات کا ایک سبق ہے کہ موجودہ دنیا صرف جدوجہد کی جگہ ہے۔ وہ پانے کی جگہ نہیں۔

تقدیرِ انسانی

مشہور مسیحی مشنری بلی گراہم (Billy Graham) نے بتایا ہے کہ ایک بار وہ سفر میں تھے۔ اس دوران اُن کو ایک دولت مند امریکی کا پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملو۔ بلی گراہم اپنا سفر ملتوی کرکے مذکورہ امریکی دولت مند کے پاس پہنچے۔

امریکی دولت مند کے گھر پہنچتے ہی اُن کو ایک علٰیحدہ کمرہ میں لے جایا گیا۔ یہاں مذکورہ امریکی دولتمند اُن کا انتظار کررہا تھا۔ ملاقات ہوئی تو امریکی دولت مند نے بلی گراہم سے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ میں جلد ہی ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانے والا ہوں۔ نوجوان! کیا تم مجھ کو امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leaf into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

یہ صرف ایک امریکی دولت مند کی کہانی نہیں، بلکہ یہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ چھوٹا آدمی ہو یا بڑا آدمی۔ ہر شخص آخر کار اِسی احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے لیے ایک پسندیدہ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنا سارا وقت اس میں لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مختصر زندگی کا آخری وقت آجاتا ہے اور وہ اِس احساسِ مجبوری کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ پانا چاہتا تھا اس کو وہ پا نہ سکا۔

ایسا کیوں ہے۔ اس وسیع کائنات میں انسان واحد مخلوق ہے جو اپنے سینے میں بے شمار خواہشات (desires) رکھتا ہے۔ کیا یہ خواہشات اسی لیے ہیں کہ وہ کبھی پوری نہ ہوں اور ہر انسان خود اپنی خواہشوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جائے۔ ہر عورت اور مرد کے ذہن میں خوابوں کی ایک دنیا بَسی ہوئی ہے۔ کیا سُہانے خوابوں کی یہ دنیا صرف اس لیے ہے کہ وہ محض خواب بن کر رہ جائے اور کبھی اُس کی تعبیر نہ نکلے۔ ہر انسان تمنّاؤں کا ایک باغ اپنے سینے میں اُگاتا ہے، مگر کسی انسان کو یہ

خوشی نہیں ملتی کہ وہ اس خوبصورت باغ میں داخل ہو سکے۔

فطرت میں یہ تضاد کیوں ہے۔ انسان کے سوا وسیع کائنات میں ایسا تضاد کہیں موجود نہیں۔ نباتات، جمادات اور حیوانات کی پوری دنیا اس قسم کے تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ پھر یہ تضاد استثنائی طور پر صرف انسان کی زندگی میں کیوں پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اور کائنات کی دوسری چیزوں کے درمیان ایک بے حد بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی زندگی کے دو مرحلے ہیں — موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات اور موت کے بعد کا مرحلۂ حیات۔ اس کے برعکس کائنات کی بقیہ تمام چیزوں کا صرف ایک مرحلہ ہے۔ یعنی وجود میں آنا اور پھر ایک دن مٹ جانا، پیدا ہونا اور پھر مَر کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا۔ اصل یہ ہے کہ انسان جو کچھ اپنے پہلے مرحلۂ حیات میں پانا چاہتا ہے وہ اس کے لیے دوسرے مرحلۂ حیات میں مقدر کیا گیا ہے۔ اور جو چیز سفرِ حیات کے اگلے مرحلے میں ملنے والی ہو، وہ سفرِ حیات کے ابتدائی مرحلے میں کبھی کسی کو نہیں ملتی۔ اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے فطرت کا ایک خصوصی قانون ہے جو اس کائنات کی دوسری چیزوں کے لیے نہیں۔ وہ یہ کہ انسان کی زندگی کو عمل اور جزا کے اُصول کے تحت رکھا گیا ہے۔ یعنی موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں عمل کرنا اور موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں اس کا انجام پانا۔

یہی قانون انسان کی زندگی کے معاملے کو سمجھنے کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قانون کو سمجھنے کے بعد انسان کی پوری زندگی بامعنیٰ بن جاتی ہے۔ یہ قانون انسان کی زندگی کے تمام سوالات کا کامل جواب فراہم کرتا ہے۔ اس قانون کو جاننے کے بعد پوری انسانی زندگی کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے۔ اس قانون کے مطابق موت سے پہلے کی دنیا انسان کے بیج ڈالنے کا مرحلہ ہے اور موت کے بعد کی دنیا اس کے نتیجے میں ہَرا بھرا درخت اور پھول و پھل پانے کا مرحلہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ موجودہ دنیا میں پھول اور پھل حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش نہ کرے بلکہ وہ اپنی ساری توجّہ بہترین طور پر تخم ریزی میں لگا دے۔ یہ وہ انسان ہے جو موت کے بعد کی دنیا میں جنت کی صورت میں وہ سب کچھ پالے گا جس کو وہ موت سے پہلے کی دنیا میں نہ پا سکا تھا۔

جنت اور جہنم

اسلام کی تعلیم کے مطابق، موجودہ دنیا ایک عارضی دنیا ہے۔ ہر انسان کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ موت کے بعد آخرت کی دنیا میں پہنچے، جہاں لوگوں کو ان کے عمل کے مطابق یا جنت میں جگہ ملے گی یا جہنم میں۔ اس تعلیم کے مطابق، جنت اور جہنم دونوں زندہ حقیقتیں ہیں۔ دونوں اسی طرح ایک زندہ واقعہ ہیں، جس طرح تاج محل ایک زندہ واقعہ ہے، یا لال قلعہ ایک زندہ واقعہ ہے۔ اسلام جب لوگوں کے اندر اپنی اسپرٹ کے ساتھ زندہ ہو تو اسلام کو ماننے والا ہر آدمی جنت اور جہنم کو حقیقی واقعہ سمجھتا ہے۔ اس کے اندر جنت کا زندہ اشتیاق موجود ہوتا ہے، اور جہنم کا زندہ خوف۔

مگر جب امت پر زوال کا دور آجائے، اس وقت امت کے افراد میں جنت اور جہنم کا زندہ تصور موجود نہیں رہتا۔ اس کے افراد رسمی عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم کو مانتے ہیں، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا کہ جنت ان کا سب سے بڑا کنسرن (concern) بنا ہوا ہو، اور جہنم کا خوف ان کے سینے میں ایک زلزلہ بن کر سمایا ہوا ہو۔ ان کا حال عملاً وہی ہو جاتا ہے جو حیوانات کا حال ہوتا ہے۔ حیوانات کے اندر نہ جنت کا شوق ہوتا ہے، اور نہ جہنم کا خوف۔ یہی حال زوال یافتہ لوگوں کا ہو جاتا ہے۔ وہ رسمی عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم کو مانتے ہیں، لیکن زندہ عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم ان کے ذہن کا جزء نہیں ہوتا۔

قرآن میں ہے: وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ (3:133) یعنی اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔ اس کے برعکس، جہنم کا تذکرہ قرآن میں بار بار اس طرح ہولناک انداز میں کیا گیا ہے کہ اگر آدمی سوچے تو اس کا چین اور سکون ختم ہو جائے۔ لیکن دورِ زوال میں امت کے افراد کے اندر نہ جنت کا شدید اشتیاق موجود رہتا ہے، اور نہ جہنم کا شدید خوف۔ دورِ زوال کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

نشانِ منزل

ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے جب سڑک بنائی جاتی ہے تو اس میں جگہ جگہ نشانات لگائے جاتے ہیں۔ یہ نشانات مسافر کو بتاتے ہیں کہ وہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ یہ نشانات بتاتے ہیں کہ مسافر کے لیے صحیح سمت کیا ہے۔ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے وہ آخر کار اپنی مطلوب منزل تک پہنچ جائے۔ جو آدمی ان نشانات کی پیروی کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے گا۔ وہ یقینا اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

اسی طرح زندگی کے سفر کا بھی ایک راستہ ہے۔ اس راستہ میں بھی کچھ نشانات مقرر کردیے گئے ہیں۔ جو آدمی چاہتا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ راستہ کے نشانات کو پڑھے اور پوری طرح اس کی پیروی کرے۔

زندگی کے سفر کے یہ نشانات کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر اپنے لیے ایک راستہ کا انتخاب کرے، ایک ایسا راستہ جس کو پھر کبھی چھوڑنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ راستہ بدلنا گویا اپنے سفر کو پیچھے لے جانا ہے۔ وہ اپنے سفر کی مدت کو کم کرنا ہے۔ کامیابی ہر راستہ میں ممکن ہے مگر جو آدمی اپنا راستہ بدلتا ہے وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے بعد دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ راستہ کی رکاوٹوں میں کبھی نہ الجھے۔ وہ ہر رکاوٹ سے اعراض کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جائے۔ رکاوٹوں سے ٹکرانا زندگی کے سفر کو روک دیتا ہے اور رکاوٹوں کو نظر انداز کرنا زندگی کے سفر کو مسلسل جاری رکھتا ہے۔

پھر مسافر کو چاہیے کہ وہ درمیان میں ملنے والے چھوٹے چھوٹے فائدوں پر قانع نہ ہو، وہ اپنے نشانہ سے کبھی نظر نہ ہٹائے۔ بڑی کامیابی پانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس دنیا میں بڑی کامیابی صرف اس انسان کا حصہ ہے جو چھوٹی کامیابی پر راضی نہ ہو۔ جو بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے فائدہ کو نظر انداز کرسکے۔ جو مستقبل کی امید میں حال سے اوپر اٹھ جائے۔

فہرستِ آرزو

کلیری سمپسن (Cleary Simpson) امریکا کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مختلف قسم کے وقتی جاب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تمناؤں کے مطابق، اُن کو امریکا کے ٹائم میگزین میں اپنی پسند کا کام مل گیا۔ اس وقت وہ ٹائم میگزین کے دفتر (نیویارک) میں ڈائرکٹر (Advertising Sales Director) ہیں۔

ٹائم کے شمارہ 5 اگست 1991 (صفحہ 4) میں مذکورہ خاتون کا ہنستا ہوا پُر ابتہاج فوٹو چھپا ہے۔ وہ اِس عہدے کے ملنے پر انتہائی خوش ہیں۔ تصویر کے نیچے اُن کا پرمسرت تاثر اِن لفظوں میں درج ہے — ٹائم کے لیے کام کرنا ہمیشہ سے میری فہرستِ آرزو پر تھا:

Working for Time was always on my wish list.

ہر آدمی کسی چیز کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے، وہ اس کی تمنا میں جیتا ہے، وہ اس کا خواب دیکھتا ہے، وہ اِس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ دن آئے جب کہ وہ اپنی اِس محبوب چیز کو پالے۔ یہ چیز اس کی فہرستِ آرزو میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز اِس طرح مرکزِ تمنا بنی ہوئی نہ ہو۔

مومن وہ ہے جس نے جنت کو اپنی فہرستِ آرزو (wish list) میں لکھ رکھا ہو، یعنی ابدی اور معیاری نعمتوں کی وہ دنیا جہاں وہ اپنے رب کو دیکھے گا، جہاں سچے انسانوں سے اس کی ملاقات ہوگی، جہاں وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں زندگی گزارے گا، وہ دنیا جو لغو اور تاثیم (الواقعۃ: 25) سے پاک ہوگی، جہاں صخب (شور) اور نصب (تکان) کو ختم کر دیا جائے گا، جس کا ماحول چاروں طرف حمد اور سلامتی سے بھرا ہوا ہوگا (الواقعۃ: 26)، جہاں خوف اور حزن (الفاطر: 34) کو حذف کیا جاچکا ہوگا، جہاں ایسی آزادی ہوگی جس پر کوئی قید نہیں (الانسان: 20)، جہاں ایسی لذتیں ہوں گی جن کے ساتھ محدودیت (limitations) شامل نہیں۔

خدا کا پڑوس

جنت کیا ہے، جنت دراصل خدا کے پڑوس میں رہنے کا نام ہے (التحریم : 11)۔ موت سے پہلے کی دنیا میں مومن احساس کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں جیتا ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں مومن واقعہ کے طور پر خدا کے پڑوس میں زندگی گزارے گا۔

خدا بلا شبہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اِس لیے کسی انسان کو حقیقی سکون صرف خدا کے پڑوس میں مل سکتا ہے، اِس سے کم تر درجے کی کوئی چیز انسان کے لیے حقیقی سکون کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ دنیا دراصل اسی قسم کے انسانوں کا انتخابی مقام (selection ground) ہے۔ یہاں اُن انسانوں کو چنا جارہا ہے جو اپنی صفات کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ جن کی سوچ، جن کی سرگرمیاں، جن کے جذبات، جن کا سلوک، جن کے معاملات اُس اعلیٰ اخلاقی معیار پر پورے اتریں جو خدا کا پڑوسی بننے کے لیے مطلوب ہیں۔ یہی لوگ اِس عزت کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔ یہ انتخاب فرشتوں کے ریکارڈ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ آخرت کی ابدی زندگی میں کسی کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی یہ خوش قسمتی تمام تر ذاتی خصوصیت (merit) کی بنیاد پر حاصل ہوگی۔

خدا کا پڑوس گویا کہ ایک کائناتی باغ ہے۔ اِس کائناتی باغ میں صرف خدائی معیار پر پورا اترنے والے لوگ ہی جگہ پائیں گے۔ خدائی معیار سے کم تر کوئی چیز کسی آدمی کو اِس کائناتی باغ میں جگہ دینے والی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا کی زندگی میں صرف خدا کو اپنا واحد کنسرن (supreme concern) بنایا ہو، جن کی سوچ اور جن کے جذبات تمام تر خدا کے لیے وقف ہو گئے ہوں جن کی صبح بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور جن کی شام بھی خدا کی یاد سے معمور۔ یہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔

جنت کا سودا

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من خاف أدلج، و من أدلج بلغ المنزل۔ ألا ،إن سلعة الله غاليةٌ۔ ألا ،إنّ سلعة الله الجنة (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2388) یعنی جس کو اندیشہ ہوتا ہے، وہ سفر میں اِدلاج کرتا ہے۔ اور جو ادلاج کرتا ہے، وہ منزل پر پہنچتا ہے۔ سن لو، اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے۔ سن لو، اللہ کا سودا جنت ہے۔

'ادلاج' کا مطلب ہے — رات کے اندھیرے میں سفر شروع کرنا۔ قدیم عرب میں یہ رواج تھا کہ مسافر رات کے اندھیرے سے اپنا سفر شروع کرتا تھا، تا کہ صبح کو دھوپ تیز ہونے سے پہلے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ یہ صحرائی سفر کا طریقہ تھا، کیوں کہ صحرائی سفر میں یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آدمی تیز دھوپ کی زد میں آجائے تو وہ خود بھی مر جائے گا اور اس کا اونٹ بھی ہلاک ہو جائے گا۔

جنت کے طالب کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جنت کے طالب کو نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنا منصوبہ بنانا ہے۔ اس کو اتنی زیادہ تیاری کے ساتھ جنت کے سفر پر روانہ ہونا ہے کہ کوئی قابلِ قیاس یا ناقابلِ قیاس عذر (excuse) اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ کوئی بھی چیز اس کو درمیانی راستے سے منحرف نہ کر دے۔ کوئی بھی چیز اس کو سیدھے راستے سے ہٹانے والی ثابت نہ ہو۔

ایک تاجر دنیا کے تجارتی سودے کے لیے آخری حد تک اہتمام کرتا ہے۔ خدا کا سودا جو کہ جنت ہے، وہ تمام سودوں سے زیادہ قیمتی سودا ہے۔ اِس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ جنت کے سفر کی منصوبہ بندی میں آخری حد تک اہتمام کرے، جس طرح وہ دنیا کے سفر میں منصوبہ بندی (planning) کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح غفلت کا شکار ہونے سے بچائے — جنت کسی انسان کو حقیقی عمل کی بنیاد پر ملے گی، نہ کہ محض خوش فہمیوں کی بنیاد پر۔

منصوبہ بند عمل کامیابی کا ذریعہ ہے۔ دنیا کی کامیابی منصوبہ بند عمل کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے۔ اِسی طرح آخرت کی کامیابی بھی منصوبہ بند عمل (Akhirat-oriented planning) کے ذریعہ ہی ممکن ہوگی۔

امتحان گاہ

ایک طالب علم جب امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے تو وہاں وہ اپنے آپ کو ایک وسیع کمرہ میں پاتا ہے۔ اس کے لیے وہاں پہلے سے آرام دہ کرسی اور میز بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے چاروں طرف گملے ہوتے ہیں جن میں خوب صورت پھول سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں خادم بھی ہوتے ہیں جو اس کے اشارہ پر فوراً اس کی ضرورت پوری کریں۔ ہال کی کھڑکیاں چاروں طرف سرسبز وشاداب پارک کا منظر دکھا رہی ہوتی ہیں، وغیرہ۔

مگر طالب علم ان میں سے کسی چیز سے بھی لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ بظاہر خوشی اور لذت کے ماحول میں بھی وہ خوشی اور لذت سے محروم رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت طالب علم کے ذہن پر صرف ایک بات کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ میں امتحان گاہ میں ہوں۔ یہاں میں کسی بھی چیز کا مالک نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے وہ کسی اور کا ہے۔ مجھ کو یہاں صرف اس لیے داخلہ ملا ہے کہ میں امتحان کے پرچے میں دیے ہوئے سوالات کو حل کروں۔ مزید یہ کہ میرے پاس صرف محدود وقت ہے، اس محدود وقت کا واحد استعمال یہ ہے کہ میں اس کو امتحان میں لگاؤں۔ اس کے سوا اور دوسری ہر مشغولیت میرے لیے وقت کا ضیاع ہے نہ کہ وقت کا استعمال۔ ٹھیک یہی معاملہ انسان کا موجودہ دنیا کی نسبت سے ہے۔ یہ دنیا ایک وسیع امتحان گاہ ہے۔ اس دنیا میں جو آدمی بھی آتا ہے وہ امتحان دینے کے لیے آتا ہے، اس بات کا امتحان کہ کسی انسان نے خدا کا سچا اعتراف کیا یا نہیں، انسان نے دوسرے لوگوں کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا یا وہ اس میں کوتاہ ثابت ہوا۔

دنیا کی یہ امتحانی نوعیت اگر آدمی کے اوپر پوری طرح واضح ہو تو یہاں اس کا حال وہی ہو جائے گا جو کسی امتحان ہال میں طالب علم کا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ بے فکری کے ساتھ زندگی گزارے۔ وہ خوشیوں اور لذتوں میں گم ہو جائے۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی جگہ ہوگی نہ کہ راحتیں سمیٹنے کی جگہ۔

امتحان کے لیے

امتحان ہال میں طالب علم کو بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں — بلڈنگ، میز، کرسی، ملازم کاغذ اور بہت سی دوسری چیزیں۔ وہ بلا روک ٹوک ان چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ آزادانہ طور پر ان کے درمیان اپنی نشست پر بیٹھتا ہے۔ بلڈنگ اس کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے۔ میز اور کرسی اس کو آرام کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ کاغذ اور دوسرے سامان اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرے اور جو چاہے کاغذ کے صفحہ پر مرتسم کرے۔

مگر یہ سب کچھ جو طالب علم کو ملتا ہے وہ امتحان کے طفیل میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس وقت تک کے لیے اس کا ہے جب تک امتحان کی مدت پوری نہ ہو جائے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوتی ہے اس سے وہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے جو اس کو اب تک بے روک ٹوک ملا ہوا تھا، جو دیکھنے والوں کو اس کا ذاتی اثاثہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ دنیا میں انسان کا ہے۔ یہاں آدمی کو بظاہر بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے یہاں رہے اور جس طرح چاہے اپنی ملی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔

مگر یہاں جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ سب امتحان کے طفیل میں ہے۔ خدا موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان لے رہا ہے۔ اور اس امتحان کے تقاضے کے تحت وہ بہت سی ضروری چیزیں انسان کو دے دیتا ہے۔ مگر یہ آدمی کے پاس صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان کی مدّت ختم نہ ہو جائے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک اس سے سب کچھ چھن جائے گا۔ وہ آدمی جو آج ظاہر سب کچھ پائے ہوئے ہے وہ اس وقت بالکل بے کچھ ہو جائے گا۔ اس دن وہ اس مسافر کی طرح ہو با جس کو اچانک لق ودق صحرا میں ڈال دیا جائے۔ وہ اس انسان کی طرح ہوگا جس کو لامتناہی خلا میں بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔

موجودہ حالت اور اگلی حالت کے درمیان صرف موت کی غیر مرئی دیوار حائل ہے۔

پہلے آپ

ڈاکٹر سوجات موکو انڈونیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر تھے۔ وہ جکارتا یونیورسٹی میں ایک علمی موضوع پر لکچر دے رہے تھے۔ عین لکچر کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ اسٹیج ہی پر گر پڑے اور اسی وقت وفات پا گئے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جو اقوام متحدہ کی امن یونیورسٹی (ٹوکیو) کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں:

Prof. Dr. Soedjatmoko, one of the leading intellectuals of Indonesia while delivering a lecture at a University campus, in Jogiakarta, had a heart attack, collapsed and expired. He was the first Asian to become the President of UN's Peace University in Tokyo. He has written a number of books.

ڈاکٹر سوجات موکو کا کیس موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کیس ہے۔ پریس اور میڈیا اور پلیٹ فارم کے ظہور نے ہر آدمی کو بولنے کے لامتناہی مواقع دے دیئے ہیں۔ ہر آدمی صبح وشام بولنے میں مصروف ہے۔ آج ہر آدمی دوسروں کو سنا رہا ہے۔ حالاں کہ خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہر آدمی کی طرف آرہے ہیں تاکہ اس کو لے جا کر وہاں کھڑا کر دیں جہاں اس کو صرف سننا ہے، سنانے کا موقع آخری طور پر اس کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

علم لفظوں سے واقفیت کا نام نہیں ہے بلکہ معانی سے واقفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑا کام بولنا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا کام چپ رہنا ہے۔ یہاں اصل اہمیت اظہار رائے کی نہیں ہے بلکہ اظہار رائے سے پہلے سوچنے کی ہے۔ بولنے والا حقیقۃً وہ ہے جو اپنے آپ سے بولے۔ بتانے والا وہ ہے جو اپنے دماغ کو سوچنے میں لگائے۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا وہ ہے جو دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرے، جو دوسروں کو مخاطب کرنے سے پہلے اپنا مخاطب خود بن جائے۔ جو دوسروں پر بلڈوزر چلانے کا نعرہ لگانے سے پہلے خود اپنی ذات پر بلڈوزر چلا چکا ہو۔

دوسروں کو مخاطب کرنا سب سے آسان ہے اور اپنے آپ کو مخاطب کرنا سب سے مشکل۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہیں۔

اچانک پیشی

موت لازماً ہر انسان پر آتی ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بیمار ہوتا ہے، وہ حادثے کا شکار ہوتا ہے، وہ خرابیٔ صحت کی بنا پر بیڈ ریڈن (bedridden) ہوجاتا ہے۔ اور آخر میں پھر مر جاتا ہے۔ مگر کچھ موتیں ایسی ہیں جو اچانک آتی ہیں۔ جیسے انڈیا کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر عبدالکلام جو 27 جولائی 2015 کو اچانک شیلانگ میں وفات پاگیے۔ اس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوکر اپنا لکچر دے رہے تھے۔ آخری جملہ وہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کا خاتمہ ہوگیا۔

اچانک موت کا مطلب اچانک پیشی ہے۔ اچانک موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا حساب دینے کے لیے اچانک مالک یوم الدین کی عدالت میں حاضر کردیا جائے۔ ایک ایسے مقام پر جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: ما منكم من أحد إلا وسيكلّمه الله يوم القيامة، ليس بين الله وبينه ترجمان (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6539) یعنی تم میں سے ہر ایک سے ضرور اللہ کلام کرے گا، اس طرح کہ اللہ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا۔

ہر آدمی پر لازماً موت کا لمحہ آنے والا ہے۔ خواہ وہ لمحہ اچانک آئے یا تاخیر کے ساتھ آئے۔ یہ تصور انسان کو ہلا دینے والا ہے کہ وہ بے اختیار و مددگار حالت میں ایک دن اپنے آپ کو اس طرح پائے گا کہ ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف اللہ رب العالمین۔ اس پیشی کے بارے میں عمر بن خطاب نے فرمایا: تجہّزوا للعرض الأکبر (الزہد والرقائق لابن المبارک: 306) یعنی بڑی پیشی کے لیے تیاری کرو۔

بڑی پیشی کے لیے تیاری یہ ہے کہ آدمی اس سوچ کے ساتھ جیے کہ اس کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا ہے جو اللہ رب العالمین کی عدالت میں قبول ہونے والی نہ ہو۔ وہ اپنے قول اور اپنے عمل کا اس اعتبار سے نگراں بن جائے۔ وہ اپنا محاسبہ آپ کرنے لگے۔ وہ شام کو سوئے تو اسی احساس کے ساتھ سوئے، اور صبح کو جاگے تو اسی احساس کے ساتھ جاگے۔

تنکیس کا عمل

قرآن میں زندگی کی ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ (36:68) یعنی اور ہم جس کو زیادہ عمر دیتے ہیں، اس کو اس کی خلقت میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں، تو کیا وہ سمجھتے نہیں۔ تنکیس کا لفظی مطلب ہے پیچھے لوٹانا (to invert)۔

عضویاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کو پیدائشی طور پر جو جسم دیا گیا ہے، وہ ایک انوکھے قسم کا جسم ہے۔ انسانی جسم کے اندر 78 آرگن (organs) ہوتے ہیں۔ یہ آرگن مسلسل طور پر بے حد کوآرڈینیشن (coordination) کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ یہ عمل جسم کے اندر خودکار نظام (automatic system) کے تحت ہوتا ہے۔ اسی فطری نظام کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی کا جسم مسلسل طور پر کام کرتا رہے۔

مگر ہر آدمی پیدا ہونے کے بعد بچپن اور جوانی کے مراحل سے گزرتے ہوئے آخر کار بڑھاپے کی عمر تک پہنچتا ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں یہ آرگن رفتہ رفتہ انسان کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں، کوئی جزئی طور پر، کوئی کلی طور پر۔ یہی وہ واپسی کا عمل ہے جو انسان کو بوڑھا اور آخر کار ناکارہ بنا دیتا ہے۔ اس عمل کو قرآن میں تنکیس کہا گیا ہے۔ یعنی دیے ہوئے اعضا کو واپس لینا۔ واپسی کا یہ عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک طاقت ور خالق ہے، وہ پہلے یہ اعضا انسان کو دیتا ہے، اور پھر اپنی مرضی کے مطابق ان کو واپس لے لیتا ہے۔ یہ ایک حتمی عمل ہے، جس کو کوئی روکنے والا نہیں۔

انسانی جسم کے اندر ہونے والا یہ واقعہ اپنے اندر ایک عظیم سبق رکھتا ہے۔ آدمی اگر اس عمل پر غور کرے تو وہ بیک وقت دو حقیقتوں کو دریافت کرے گا۔ ایک طرف یہ حقیقت کہ یہاں ایک قادرِ مطلق (All Powerful) خدا ہے، اور دوسری طرف یہ حقیقت کہ وہ خود ایک عاجز مطلق (all powerless) مخلوق ہے۔ دینے والا دے تو اس کو ملے گا، اگر دینے والا نہ دے تو اس کو کچھ ملنے والا نہیں۔ یہی وہ دریافت ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت انسان کو انسان بناتی ہے۔

اعلیٰ ذوق

قرآن کی سورہ التین میں تخلیقِ انسانی کے معاملے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ○ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ○ (95:1-8) قسم ہے تین کی اور زیتون کی۔ اور طورِ سینا کی۔ اور اِس امن والے شہر کی۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔

قرآن کی اس سورہ میں احسن تقویم سے مراد یہ ہے کہ انسان کو نہایت اعلیٰ ذوق (high taste) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کے اندر جو احساس لذت (sense of enjoyment) ہے، وہ کسی بھی دوسری مخلوق میں نہیں، نہ جمادات میں، نہ نباتات میں، نہ حیوانات میں۔

اسفل سافلین میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے تخلیقی ساخت کے اعتبار سے اعلیٰ تسکین (satisfaction) کا طالب ہے۔ لیکن انسان کو اس دنیا میں کوئی بھی چیز اس کی طلب کے مطابق نہیں ملتی۔ اس دنیا میں انسان کو مسلسل طور پر عدم تشفی (unfulfillment) کی حالت میں جینا پڑتا ہے۔ گویا کہ انسان ایک ایسا طالب ہے جس کا مطلوب اس کو حاصل نہیں۔

خدا کے احسن الخالقین ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یقیناً احکم الحاکمین بھی ہے۔ اس پہلو پر غور کرنے سے اس معاملے کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس فرق کو سمجھے۔ وہ اس تخلیقی حکمت کو دریافت کرے، اور پھر اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ جو آدمی اس معرفت کا ثبوت دے، اس کے لئے آخرت کی ابدی دنیا میں اجر غیر ممنون (unending reward) مقدر کیا گیا ہے۔

حُبّ عاجلہ

قرآن میں انسان کے ایک مزاج کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ (76:27)۔یعنی یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز کو چاہتے ہیں:

Those people aspire for immediate gains.

حب عاجلہ کا مزاج پہلے بھی انسان کے اندر تھا، مگر اب وہ اتنا زیادہ عام ہو چکا ہے کہ شاید اس میں کوئی استثنا باقی نہیں رہا۔ اعلان یا اعلان کے بغیر ہر ایک کا نشانہ یہ ہے کہ ابھی اور اسی وقت (right here, right now)۔اس نظریہ کے ماننے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر اب نہیں تو کب:

If not now, when?

جو لوگ ایسا کہتے ہیں، وہ یقینا سوچے بغیر ایسا کہہ رہے ہیں۔کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آج حاصل کرلو، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج بھی کیوں ہمارا مطلوب حاصل نہیں ہوتا۔تاریخ بتاتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان نے یہ چاہا کہ وہ اس دنیا میں اپنی خواہش کو پورا کرے، مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ ہر آدمی اپنی خواہش کو پورا کئے بغیر اس دنیا سے چلا گیا۔

پوری تاریخ میں کوئی بھی انسان ایسا نہیں جو اس معاملے میں استثناء (exception) کی حیثیت رکھتا ہو۔ایسی حالت میں اصل سوال یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں، اس کو آج ہم حاصل کرلیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں، وہ آج کی زندگی میں کیوں حاصل نہیں ہوتا۔اس سوال پر غور کیا جائے تو آدمی اس نتیجے تک پہنچے گا کہ خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق ہمارا مطلوب آج کی دنیا میں حاصل ہونے والا نہیں۔

انسان تمام مخلوقات میں استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ فطرت کی زبان میں انسان کے سوال کا جواب ہے۔فطرت کا یہ تقاضا بتاتا ہے کہ انسان کا مطلوب کل کے دورِ حیات میں ملنے والا ہے، آج کے دورِ حیات میں اس کا ملنا فطرت کے قانون کے مطابق مقدر ہی نہیں۔

فطرت کا عطیہ

ایک حدیثِ رسول میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کو اللہ کے سامنے 5 سوالوں کے جواب دینے ہوں گے: لاتزول قدم ابن آدم یوم القیامۃ من عند ربہ حتی یُسئل عن خمس (قیامت کے دن انسان کے قدم اس کے رب کے سامنے سے اس وقت تک نہ ہٹیں گے جب تک کہ وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے لے) ان پانچ باتوں میں سے ایک یہ ہے: عن شبابہ فیما ابلاہ (جوانی کس چیز پر گزاری)۔سنن الترمذی، حدیث نمبر 2416۔

بظاہر اس حدیث میں یہ ہے کہ اپنی جوانی کیسے گزاری۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کو تخلیق کے اعتبار سے جو خاص صلاحیت عطا کی اس کو کہاں استعمال کیا۔ ہر عورت یا مرد جو پیدا ہو کر اس زمین پر آتا ہے، وہ اپنے اندر ایک خاص صلاحیت (unique quality) لے کر آتا ہے، خالق کو یہ مطلوب ہے کہ ہر ایک اپنی اِس صلاحیت کو دریافت کرے، اور اِس صلاحیت کو خدائی نقشہ کے مطابق بھر پور طور پر استعمال کرے۔ جو عورت یا مرد ایسا نہ کرے وہ یقینی طور پر آخرت میں اللہ کے یہاں پکڑے جائیں گے۔ آخرت میں ہر ایک کا معاملہ اس بنیاد پر ہوگا کہ اس نے اپنی خداداد صلاحیت (God given quality) کو صحیح طور پر استعمال کیا یا نہیں۔ جو انسان اِس زمین پر پیدا ہوتا ہے، اُس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دریافت کرے۔ وہ اِس دنیا میں اپنے رول کو سمجھے، اور اللہ کی ہدایت کے مطابق، اپنے اِس رول (کردار) کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ادا کرے۔ جو شخص ایسا کرے، اُس کے لیے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ابدی جنت ہے، اور جو شخص ایسا نہ کرے، اُس کے لیے دنیا میں بھی ناکامی ہے، اور آخرت میں بھی ناکامی۔ جس شخص نے اپنے لیے فطرت کے عطیے کو جانا، وہ ایک کامیاب انسان ہے۔ اِس کے برعکس جس شخص نے اپنے بارے میں فطرت کے عطیہ کو نہیں جانا، وہ خالق کے نزدیک اندھا بہرا ہے۔ ایسے عورت یا مرد کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

سب سے بڑی بے خبری

مرنے والے مر گئے — یہ سب کو معلوم ہے۔ مگر ایک اور خبر ایسی ہے جو کسی کو معلوم نہیں، وہ یہ کہ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے۔ ایک دن میرا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو انجام دوسروں کا ہو چکا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ دوسروں کو ہر روز مرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن خود اپنے آپ کو وہ اُس سے الگ (exempt) کر لیتے ہیں۔ گویا کہ ہر آدمی بلا اعلان اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ — دوسروں کو مرنا تھا، وہ مر گئے، لیکن میں تو مرنے والا نہیں۔

یہ بے خبری ایک ہلاکت خیز بے خبری ہے۔ یہ وہ انوکھی بے خبری ہے جس کو شتر مرغ کی عادت (ostrich habit) کہا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنی موت کے بارے میں سوچے یا نہ سوچے، موت بہر حال اس کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔

موت گویا کہ ایک انفرادی زلزلہ ہے۔ زلزلہ اعلان کے بغیر آتا ہے۔ اِسی طرح موت بھی اعلان کے بغیر آتی ہے۔ زلزلے کے مقابلے میں ہر آدمی بے بس ہے۔ اِسی طرح موت کے مقابلے میں بھی ہر آدمی بالکل بے بس ہے۔ موت اچانک آتی ہے اور وہ آدمی کے خیالی محل کو مکمل طور پر ڈھا دیتی ہے۔ انسان اگر یہ چاہے کہ وہ موت کو روک دے تو ایسا ہونے والا نہیں۔ موت کا اپنا قانون ہے، جو انسان کی مرضی کے بغیر اپنا کام کرتا ہے۔

اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی موت کے بارے میں بے حد حساس ہو۔ وہ ہر لمحہ موت کو یاد کرتا رہے۔ ہر روز جب شام آئے تو وہ محسوس کرے کہ اب اس کے لیے اگلی صبح مقدر نہیں۔ ہر روز جب وہ اپنے بستر پر سوئے تو اس کا احساس یہ ہو کہ اب دوبارہ اِس دنیا میں میری نیند کھلنے والی نہیں۔ یہ احساس اگر آدمی کو ہو جائے تو وہ آخری حد تک ہل جائے گا۔ اس کے لیے جینا سادہ معنوں میں صرف جینا نہ رہے گا، بلکہ وہ موت کا انتظار بن جائے گا — خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو موت کے اچانک حملے سے پہلے موت سے باخبر ہو جائیں، وہ موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری کر لیں۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

دنیا کی زندگی امتحان (test) کی زندگی ہے۔ یہاں کوئی بھی قانون یا کوئی بھی عدالت انسان کو مجبور نہیں کرسکتی کہ وہ ہمیشہ درست رویہ پر قائم رہے۔ انسان کو درست رویہ پر قائم کرنے والی چیز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کے دل میں یہ احساس بیٹھ جائے کہ وہ کسی بھی حال میں اللہ رب العالمین کی پکڑ سے بچنے والا نہیں ہے۔ اللہ رب العالمین کے مقابلے میں اس کے پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اس کے پاس کوئی بھی ایسی تدبیر نہیں جو اس کے اور اللہ رب العالمین کے درمیان پردہ بن جائے۔ وہ اللہ رب العالمین کے مقابلے میں مکمل طور پر بے بس ہے۔

یہ سوچ اگر حقیقی معنوں میں کسی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کی پوری شخصیت کے اندر ایک انقلاب آ جائے گا۔ اس کی روز وشب کی سرگرمیاں بدل جائیں گی، اس کی سوچ کا انداز بدل جائے گا، اس کا زاویہ نظر بدل جائے گا، اس کے رائے قائم کرنے کا انداز بدل جائے گا، خیر وشر کے بارے میں اس کا تصور بدل جائے گا، اس کی پوری زندگی خدا رخی زندگی بن جائے گی، اس کی پوری سوچ پر آخرت کی جوابدہی کا تصور چھا جائے گا، وغیرہ۔

اس انقلاب کو قرآن وسنت میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ اس مبنی برتزکیہ سوچ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر ایک نئی شخصیت بننا شروع ہو جائے گی، ایک ایسی شخصیت جس کے اندر اللہ سے محبت ہو، اللہ سے خوف ہو۔ موت سے قبل کی دنیا کے بجائے موت کے بعد کی دنیا کی تعمیر اس کا سب سے بڑا کنسرن بن جائے گا۔ اس سوچ کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر سے فکری جمود (intellectual stagnation) کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بجائے اس کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) بیدار ہو جائے گی۔ اس کی ہر صبح نئی صبح ہوگی، اس کا ہر دن نیا دن ہوگا۔ پوری کائنات اس کے لیے فکری غذا بن جائے گی۔ اس کو ایسا محسوس ہوگا، جیسے کہ اس کو فرشتوں کی صحبت حاصل ہوگئی ہے۔

سب کچھ سے بے کچھ کی طرف

آدمی جس دنیا میں رہتا ہے، وہاں بظاہر اس کو سب کچھ ملا ہوا ہے — موافق زمین، سورج کی روشنی، ہوا، آکسیجن، پانی، خوراک، خاندان، جماعت، اِدارے، حکومتی نظام، غرض زندگی کی مددگار وہ تمام چیزیں جس کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں آدمی کو پیدا ہوتے ہی مل جاتی ہیں، اور پھر تمام عمر اس کو حاصل رہتی ہیں۔ اس بنا پر آدمی ان چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لے لیتا ہے، وہ سوچ نہیں پاتا کہ یہ چیزیں کبھی اس سے چھن جائیں گی۔ لیکن ہر آدمی کے لیے مقدر ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد اس پر موت آئے، اور تمام چیزیں اچانک اس سے چھن جائیں، آدمی اب بھی وہی ہو جو کہ موت سے پہلے تھا، لیکن زندگی کے تمام اسباب مکمل طور پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں، سب کچھ رکھنے والا آدمی، ایک لمحہ میں، بے کچھ ہو کر رہ جائے۔ یہ ایک ہونے والا واقعہ ہے، جو لازماً ہر ایک کے سامنے یقینی طور پر آئے گا، عورت کے ساتھ بھی اور مرد کے ساتھ بھی۔ یہی وہ چیز ہے جس پر سوچنے والے سب سے زیادہ سوچیں، یہی وہ چیز ہے جس کو تمام عورت اور مرد اپنا سب سے بڑا کنسرن (concern) بنائیں، یہی وہ چیز ہے جس کے تصور کو لے کر آدمی شام کو سوئے اور صبح کو جاگے۔ آدمی کے لئے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیسے ایسا ہو کہ وہ موت کے بعد کی زندگی میں دوبارہ وہ سب کچھ پالے جو موت سے پہلے کی زندگی میں اس کو ملا ہوا تھا۔ یہی ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے میں انسان کی کامیابی ہے، اور اسی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہنے کا نام، ناکامیابی ہے۔

انسان کا سفر بظاہر سب کچھ سے بے کچھ کی طرف ہو رہا ہے۔ اب سوال ہے کہ دوبارہ کس طرح ممکن ہو کہ آدمی کا سفر بے کچھ سے سب کچھ کی طرف ہو جائے۔ اس کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی خالق کے تخلیقی منصوبہ کو جانے، اور اس کے مطابق اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ یہ تخلیق کا منصوبہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی موت سے پہلے کی زندگی میں خدا کے راستے پر چلے، وہ اپنے آپ کو خدا کا مطلوب بندہ بنائے — خودرخی زندگی آدمی کو ابدی تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور خدارخی زندگی اس کو ابدی سعادت تک پہنچانے والی ہے۔

بے خوفی کی نفسیات

آج کل مسلمانوں میں ہر جگہ اسلام کی دھوم ہے۔ مشرق سے مغرب تک ہر جگہ دین کے نام پر بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر اِن ہنگامہ خیز سرگرمیوں میں وہی چیز غائب ہے جو دین کی اصل ہے، یعنی اللہ کا خوف جس کو قرآن اور حدیث میں تقویٰ کہا گیا ہے۔

آج کل مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر اُنھیں قیامت کی خبر دی جائے تو وہ ایسا جواب دیں گے، جیسے کہ انھیں قیامت کے آنے کا کوئی ڈر نہیں، اس لیے کہ ان کو "شفیع المذنبین" کا وسیلہ حاصل ہے۔ قیامت اگر آئی بھی تو وہ صرف دوسروں کے لیے ہوگی، نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

مسلمانوں کو قیامت سے ڈرائیے تو اُن میں سے کوئی شخص کہے گا کہ ابھی قیامت کہاں، ابھی تو مسیح نازل نہیں ہوئے۔ ابھی تو مہدی نہیں آئے۔ ابھی تو دجال ظاہر نہیں ہوا۔ کوئی کہے گا کہ حدیث میں آیا ہے: مَن مات فقد قامت قیامته (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 1183)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی قیامت تو ہر روز آرہی ہے۔ اِسی طرح ایک دن اجتماعی قیامت بھی آجائے گی، پھر اس کے بارے میں فکر مند ہونے کے کیا معنیٰ۔ کوئی کہے گا کہ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتیں مسلمانوں کے لیے لکھ دی گئی ہیں، پھر ایسی حالت میں قیامت سے ڈرنے کی کیا ضرورت، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثتُ أنا و الساعة جمیعًا (مسند احمد، حدیث نمبر 22947) یعنی میں اور قیامت دونوں ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ اِس کو سن کر اصحابِ رسول کا یہ حال ہوا کہ اگر آندھی بھی آجاتی تو وہ ڈر جاتے کہ شاید قیامت آگئی۔ مگر آج کل مسلمانوں کی بے خوفی کا یہ حال ہے کہ اُن سے کچھ بھی کہیے، لیکن ان کے اندر ڈر کی نفسیات نہیں پیدا ہوگی، وہ بدستور بے خوفی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔ یہ حالت صرف عام مسلمانوں کی نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کی بھی یہی حالت ہے جن کی ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر ان کو دین دار مسلمان ہونے کا لقب دیا جاتا ہے۔ یہ گراوٹ کا آخری درجہ ہے، اس کے بعد گراوٹ کا کوئی اور درجہ نہیں۔

زلزلہ ایک وارننگ

6 اپریل 2009 کو اٹلی کے وسطی علاقہ (L' Aquila) میں زلزلہ آیا۔ رپورٹ کے مطابق، اِس زلزلے میں ایک سو سے زیادہ آدمی مر گئے اور تقریباً پچاس ہزار آدمی بے گھر ہو گئے۔ زلزلہ والے علاقے کے ایک شخص نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ — بم دھماکے جیسی آواز سن کر میں اٹھ گیا۔ ہم بمشکل اُس سے بھاگ کر باہر آئے۔ ہر چیز ہل رہی تھی۔ فرنیچر گر رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی ایسی کوئی چیز اپنی زندگی میں دیکھی ہو:

> I woke up hearing what sounded like a bomb. We managed to escape with things falling all around us. Everything was shaking, furniture falling. I don't remember ever seeing anything like this in my life. (*The Times of India*, New Delhi, April 7, 2009)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اچانک (suddenly) آئے گی (الأعراف: 187)۔ اِسی طرح زلزلہ بھی اچانک آتا ہے۔ زلزلہ فطرت (nature) کا ایک انوکھا ظاہرہ ہے۔ فطرت کے اندر ہونے والے تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کے تحت پیش آتے ہیں۔ زلزلہ ایک ایسا واقعہ ہے جو دوسرے تمام واقعاتِ فطرت کے برعکس بالکل اچانک آجاتا ہے۔ اِس اعتبار سے زلزلہ آنے والی قیامت کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

زلزلے کا استثنائی طور پر قیامت سے مشابہ ہونا بے حد اہم ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ (earthquake) قیامت کی پیشگی اطلاع ہے۔ موجودہ زلزلہ چھوٹا زلزلہ ہے، اور آئندہ آنے والی قیامت زیادہ بڑا زلزلہ۔ اِس دنیا میں چھوٹا زلزلہ اِس لیے آتا ہے، تاکہ انسان ہوش میں آجائے اور بڑے زلزلے کے لیے پیشگی طور پر تیاری کرے۔ چھوٹے زلزلے میں بظاہر کچھ لوگ بچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، لیکن جب قیامت کا بڑا زلزلہ آئے گا تو کسی بھی عورت یا مرد کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اُس سے بچا سکے۔

دردناک انجام

ہر آدمی اپنی ساری توانائی خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ پیسہ کماتا ہے، صرف اِس لیے تاکہ وہ جہنم کا مہنگا ٹکٹ خرید سکے — یہ جملہ اکثر نہایت درد کے ساتھ میری زبان سے نکل جاتا ہے۔

آج کل کے لوگوں کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت پیسہ کمانے میں لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کو رات دن بس ایک ہی دُھن لگی رہتی ہے، وہ یہ کہ کس طرح وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر 102 میں تکاثر کہا گیا ہے، یعنی کماتے کماتے قبر میں پہنچ جانا اور پھر جہنم کا سامنا کرنا۔

آج کل یہ حال ہے کہ سیکولر لوگ اور نام نہاد مذہبی لوگ، دونوں ایک ہی چیز کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور وہ ہے ہر ممکن ذرائع سے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا۔

پھر اِس دولت کا استعمال بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے اپنی مادّی خوش حالی میں اضافہ کرنا۔ مکان اور سواری اور کپڑے جیسی چیزوں میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا۔ اگر کوئی شخص بظاہر مذہبی ہے، تو وہ صرف رسمی معنوں میں مذہبی ہے۔ مقصدِ زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا نشانہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے مادّی ترقی۔

ہر آدمی کی زندگی ایک تلخ انجام پر ختم ہو رہی ہے اور وہ ہے تمام مادّی ترقیوں کو چھوڑ کر اِس دنیا سے چلا جانا۔ یہ بے حد سنگین صورتِ حال ہے۔ اِس میں دنیا کے تقریباً تمام لوگ مبتلا ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق، وہ ترقی کی طرف جا رہے ہیں، مگر موت ہر ایک کو بتا رہی ہے کہ تمھارا سفر صرف تباہی کے گڑھے کی طرف تھا، نہ کہ ترقی کی منزل کی طرف۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ اپنے بہترین وقت اور اپنی بہترین توانائی کو خرچ کرکے لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ (102:6) کا مصداق بن رہا ہے، یعنی جنت کا خواب دیکھنے والا، آخرکار اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا ہوا پائے۔

موت کا شعوری ادراک نہیں

لوگوں کو موت کا علم ہے، لیکن انھیں موت کا شعوری ادراک نہیں۔ وہ موت کو جانتے ہیں، لیکن انھوں نے یقین کے درجے میں موت کو دریافت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ایسی زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ موت ان کے لیے آنے والی نہیں۔ موت کسی انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ ہے۔ لوگ اگر شعوری طور پر اس حقیقت کو جانیں تو ان کی ساری توجہ موت کی طرف ہوجائے گی۔ موت سے پہلے کی زندگی ان کے لیے صرف ایک ذمے داری بن جائے گی، اور موت کے بعد کا معاملہ ان کے لیے سب سے زیادہ اہم معاملہ بن جائے گا۔

موت کے معاملے میں اس عمومی غفلت کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کے ساتھ ہر لمحہ طرح طرح کے حالات پیش آتے ہیں۔ یہ حالات انسان کو ہر لمحہ اپنی طرف مشغول کیے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی ایک ڈسٹریکٹیڈ (distracted) زندگی بن جاتی ہے۔ اس بنا پر انسان کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ موت کے بارے میں سوچے۔ موت کے بارے میں سوچنا صرف اس انسان کے لیے ممکن ہے جو اپنے آپ کو ڈسٹرکشن سے بچائے۔ چوں کہ انسان ایسا نہیں کرتا اس لیے موت کے بارے میں اس کی غفلت بھی ختم نہیں ہوتی۔ موت کے بارے میں انسان کی غفلت صرف اس وقت ختم ہوتی ہے جب اس کے سامنے موت کا فرشتہ آ کر کھڑا ہوجائے، موت کے فرشتے کے سوا کوئی اور چیز اس کو دکھائی نہ دے۔ انسان کی یہی مشغول زندگی اس کے لیے موت کو صرف ایک دور کی خبر بنا دیتی ہے، موت اس کی زندگی میں یقین کا درجہ حاصل نہیں کرتی۔ ہر آدمی موت سے اس طرح دوچار ہوتا ہے کہ وہ اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کو کچھ دیر کے لیے مشغولیت سے خالی کرے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ موت کو یاد کرے۔ موت کے بارے میں جو آیتیں یا حدیثیں آئی ہیں، ان کا مطالعہ کرے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز نہیں جو انسان کو موت کے بارے میں حقیقت شناس بنا سکے۔

سب سے بڑی بھول

ڈِک شان(Dick Shawn)ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اوراسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ 17اپریل 1987 کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا(La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندرا یکٹنگ کررہا تھااور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منہ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جزء کے طور پر کیا ہے:

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہ ہوا۔ اس نے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھااور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ(heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 57 سال تھی (ٹائمس آف انڈیا، 20اپریل 1987)۔

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔ مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے۔ یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہوجائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔ یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

ایک نشانی

پچھلے روز ایک لیڈر کا انتقال ہو گیا۔ آج ٹی وی پر اس کے حالات دکھائے گئے۔ اتفاق سے مجھے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کل کے اخبار میں مَیں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ آج میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ وہ چل رہا ہے۔ وہ تقریر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہے۔ اس طرح دیر تک ٹی وی پر اس کی زندگی دکھائی دیتی رہی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹی وی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کہ جس آدمی کو تم نے سمجھا تھا وہ مر گیا، وہ مرا نہیں۔ وہ اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک اسی طرح زندہ ہے جیسا کہ وہ موت کا واقعہ پیش آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اگر تم کو ''ٹی وی'' کی نگاہ حاصل ہو جائے تو آج بھی تم اس کو پہلے کی طرح چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہو۔ ٹی وی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں کو دکھا رہا ہے۔ وہ آج محدود طور پر ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہے جو آئندہ مکمل طور پر تمام لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔ وہ گویا کلی مشاہدہ سے پہلے حقائق کا جزئی مشاہدہ ہے۔

آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ صبح وشام کی صورت میں اس کے دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا آخر وقت آجاتا ہے۔ وہ دنیا کے ماحول سے نکال لیا جاتا ہے تاکہ اس کو آخرت کے ماحول میں بسایا جائے اور اس کے اعمال کے مطابق اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔ ہر وہ شخص جو پیدا ہوتا ہے، وہ ضرور ایک دن موت سے دو چار ہوگا۔ اور موت کے بعد ضرور وہ آخرت کی دنیا میں داخل کیا جائے گا جہاں اس کو خدا کی عدالت میں اپنا مکمل حساب دینا پڑے۔ جس طرح زندگی یقینی ہے، اسی طرح موت یقینی ہے۔ اور جس طرح موت یقینی ہے، اسی طرح قیامت اور آخرت کا معاملہ بھی یقینی ہے۔ آدمی اس سے بھاگ نہیں سکتا، البتہ وہ تیاری کر کے اس کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دانش مند وہ ہے جو آج کے اندر کل کو دیکھ لے۔ جو آج کے واقعہ میں اپنے کل کی لیے نصیحت حاصل کر لے۔

صرف ایک بار

موجودہ دینا میں لذتِ طلب ہے، مگر یہاں لذتِ حصول نہیں۔ یہاں منزل کی طرف دوڑنا ہے، مگر یہاں کسی کے لیے اپنی مطلوب منزل پر پہنچنا مقدر نہیں۔

ایک شخص زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوتا ہے۔ وہ کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر کامیاب زندگی پالینے کے باوجود اس کا احساسِ محرومی ختم نہیں ہوتا۔ اپنے نشانہ کے مطابق، جب آدمی قابل اعتماد جاب، اچھی کار، فرنشڈ مکان، حاصل کرلیتا ہے تو اس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہ کرسکا۔ اب زندگی اسکے لیے 'عیش' نہیں رہتی، بلکہ زندگی اس کے لیے صرف ''ذمہ داری'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کھونے کی طرف تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ آدمی اس گمان میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو حاصل کر رہا ہے، حالاں کہ اس کے برعکس اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مطلوب سے دور ہوتا جارہا ہے۔ وہ اپنا سفر برعکس سمت میں جاری کیے ہوئے ہے۔ اور جو شخص جتنا زیادہ تیز رفتار ہے اتنا ہی زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جارہا ہے۔

آدمی کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو اپنا نشانہ بنایا۔ آدمی کے لیے صحیح بات یہ تھی کہ وہ آخرت کو اپنا نشانہ بنائے۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ دنیا صرف بیج بونے کی جگہ ہے، وہ فصل کاٹنے کا مقام نہیں۔ جو آدمی دنیا کو چاہے، اس نے ایسی چیز کو چاہا جو سرے سے ملنے والی نہیں۔ عقل مند وہ ہے جو آخرت کا طالب بنے۔ کیوں کہ آخرت ہی حقیقی ہے، اور وہی وہ چیز ہے جس کو کوئی پانے والا موت کے بعد کی زندگی میں اپنے لیے پائے گا۔ زندگی کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ یہ زندگی کسی کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ آدمی کو صرف ایک بار عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صرف ابدی انجام ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورتِ حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے استعمال کے معاملہ میں انتہائی حد تک سنجیدہ اور محتاط ہو، وہ اپنی زندگی کا رخ متعین کرنے میں آخری حد تک باہوش انسان بن جائے۔

کامیاب زندگی، ناکام خاتمہ

ایک مغربی ملک کے ایک آدمی کو دولت کمانے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دولت کے ذریعے وہ زندگی کی تمام خوشیاں حاصل کرسکتا ہے۔ اُس نے کافی دولت کمائی۔ اس نے اپنے لیے ایک شان دار گھر بنایا۔ ہرطرح کی راحت اورعیش کے سامان اپنے گرد اکھٹا کیے، لیکن حقیقی خوشی اس کو حاصل نہ ہوسکی، یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہوگیا۔ اس کی جسمانی طاقت ختم ہوگئی، وہ بستر پر پڑ گیا۔ اپنی زندگی کے اِس آخری زمانے میں اُس نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

> Now, I am 90 plus, bedridden. My story can be sum up in these two words— successful life, unsuccessful end.

یہی اُن تمام لوگوں کی کہانی ہے جن کو لوگ اچیور، یا سُپر اچیور کہتے ہیں۔ بڑی بڑی کامیابیوں والے اِس دنیا میں صرف چھوٹی خوشی حاصل کرتے ہیں اور آخر کار مایوسی کے ساتھ وہ اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ یہ معاملہ اتنا عام ہے کہ اِس میں کسی بھی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

انڈیا میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والوں میں ایک مشہور نام لَتا منگیشکر (پیدائش 1929) کا ہے۔ وہ اب 85 سال سے زیادہ کی ہوچکی ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں وہ تمام چیزیں ملیں جن کی لوگ حرص کرتے ہیں۔ دولت، شہرت، مقبولیت اور اعلیٰ خطابات، وغیرہ۔ انھوں نے عالمی سطح پر شاپنگ کی۔ بہت زیادہ جیولری اور جواہرات حاصل کیے۔ ہر وہ چیز اُن کے پاس ہے جس کی دنیا پرست لوگ تمنا کرتے ہیں۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر وہ محسوس کرتی ہیں کہ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا، وہ اُن کو نہیں ملا۔

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (30 ستمبر 2007) میں لتا منگیشکر کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویور کا نام سُدیشنا (Sudeshna Chatterjee) ہے۔ اِس انٹرویو کے مطابق، لتا منگیشکر تمام ظاہری کامیابیوں کے باوجود افسردگی کے احساس (dejected feeling)

میں چھپتی ہیں۔ یہ انٹرویو اخبار کے ضمیمہ (Times Life) میں اِس عنوان کے تحت چھپا ہے— میرے خواب کبھی پورے نہیں ہوئے:

'My dreams have never got fulfilled'.

انٹرویور نے لتا منگیشکر سے پوچھا کہ اگر خدا اُن سے پوچھے کہ عمر کے اِس حصے میں پہنچ کر ان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوگی۔ انھوں نے کسی وقفے کے بغیر فوراً جواب دیا کہ— میری صرف یہ خواہش ہوگی کہ میں اِس دنیا کو چھوڑ کر چلی جاؤں:

I would like to leave this world. (p. 3)

کامیاب انسانوں کی اِس ناکام کہانی میں ہر عورت اور مرد کے لیے بہت بڑا اسبق ہے۔ وہ یہ کہ جس پُرمسرت زندگی کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری عمر لگا دیتے ہیں، وہ اِس دنیا میں سِرے سے قابلِ حصول (achievable) ہی نہیں۔

تمنّا کا ہونا، مگر تمنا کے حصول کا فُقدان ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، وہ یہ کہ آدمی جس چیز کو قبل از موت (pre-death period) دنیا میں پانا چاہتا ہے، اس کو خالقِ کائنات نے بعد از موت (post-death period) دنیا میں رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بعد از موت دنیا میں کامیابی کا مستحق بنائے۔ وہ موجودہ عارضی زندگی کو بعد کی ابدی زندگی کی تیاری میں لگا دے۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (idealist) ہے، لیکن موجودہ دنیا میں ہر چیز معیار سے کم (less than ideal) حالت میں پائی جاتی ہے۔ یہی لوگوں کے ٹنشن (tension) کا اصل سبب ہے۔ انسان اپنی پوری توانائی صرف کر کے جو کچھ حاصل کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے اپنے مطلوب معیار سے کم ہوتا ہے۔ طلب اور مطلوب کے درمیان اِس فرق کو جاننا ہی سب سے بڑی دانش مندی ہے۔ جو آدمی اِس فرق کو جانے، وہ اپنے عمل کی حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کرے گا، اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ ایسا انسان کبھی ٹنشن میں جینے والا انسان نہیں ہوگا۔

آخری گیت

رتن سنگھ (پیدائش 1927) اردو کے ایک مشہور ادیب ہیں۔ ایک گفتگو کے دوران ان کے انٹرویورڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے ان سے پوچھا، آپ اپنی نمائندہ کہانی کس کہانی کو مانتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، نمائندہ کہانی تو ابھی مجھے لکھنی ہے۔ کب سرسوتی مہربان ہوجائے، کہہ نہیں سکتا۔ (ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، اکتوبر 2015، صفحہ 9) نوبیل انعام یافتہ رابندر ٹیگور نے اپنی کتاب گیتانجلی میں اپنے بارے میں لکھا ہے: ساری عمر بینا کے تاروں کوسلجھانے میں بیت گئی، جو انتم گیت میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

یہ احساس تقریباً ہر ادیب اور صاحبِ قلم کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر آئڈلسٹ (idealist) ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے آئڈیل کولفظوں میں ڈھال سکے، لیکن ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا سبب ایک فطری تضاد ہے جس سے ہر انسان زندگی میں دوچار رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فطرت سے وہ خود تو معیار پسند مزاج لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن اپنے خیال کے اظہار کے لیے اس کے پاس جو الفاظ ہوتے ہیں، وہ معیار سے کمتر ہوتے ہیں۔ اس تضاد کی بنا پر ہر باذوق انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ عملاً ایک تشنگی میں جیتا ہے، اور آخر کار اسی تشنگی میں مرجاتا ہے۔

انسان کی اس تشنگی کے پورا ہونے کا مقام صرف جنت ہے۔ یہ تشنگی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ انسان اس پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے، جو آدمی حقیقی معنوں میں متلاشی (seeker) بن کر اس پر غور کرے گا، وہ ضرور اس کا جواب پالے گا۔ اور پھر اس کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ کس چیز کو اپنی تلاش کی منزل بنائے — انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے جنت کا طالب ہے۔ انسان طالب ہے، اور جنت اس کا مطلوب۔ انسان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانے، اور اس کو اپنا منزل مقصود بنائے۔

آنا اور جانا

کالون کولج (Calvin Coolidge) امریکا کا 30 واں صدر تھا۔ وہ 4 جولائی 1872 کو پیدا ہوا، اور 5 جنوری 1933 کو اس کی وفات ہوئی۔ 1924 میں اس نے نہایت آسانی سے صدارت کا الیکشن جیت لیا تھا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ وہ خطرناک انقلابیت (dangerous radicalism) کا مخالف بن کر کھڑا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ امریکا کا صدر تھا، ایک شخص نے ظریفانہ طور پر اس سے پوچھا کہ وہائٹ ہاؤس میں کون رہتا ہے۔ صدر نے مختصر طور پر جواب دیا کہ کوئی نہیں، وہ بس آتے ہیں اور جاتے ہیں:

> The Story goes that when Calvin Coolidge was the US President, a visitor facetiously asked him who lived in the White House. “No one,” replied the incumbent laconically, “they just come and go.”

کالون کولج نے جو بات امریکا کی صدارتی رہائش گاہ (وہائٹ ہاؤس) کے بارے میں کہی، وہ زیادہ کامل طور پر پوری دنیا کے لیے صحیح ہے۔ اس دنیا میں بظاہر بے شمار گھر بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی شخص یا خاندان مقیم دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ سب صرف سطح کی باتیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی رہنے والا نہیں۔ ہر ایک بس آرہا ہے اور جارہا ہے۔ اس دنیا کا کوئی مکان مکان نہیں۔ ہر مکان گویا ایک قسم کی عارضی سرائے ہے۔ یہاں لوگ صرف اس لیے آتے ہیں کہ وہ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ یہاں لوگ صرف اس لیے بستے ہیں کہ دوبارہ انھیں یہاں کے گھروں میں بسنا نصیب نہ ہو۔

لوگ زندگی کو جانتے ہیں، مگر لوگ موت کو نہیں جانتے۔ لوگ ”رہنے“ سے واقف ہیں، مگر وہ ”جانے“ سے واقف نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے لیے مکان بنارہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ بالآخر انھیں جہاں رہنا ہے وہ جگہ وہ ہے جو خدا نے لیے مقرر کرے گا، نہ کہ وہ جگہ جو انھوں نے بطور خود اپنے لیے تعمیر کر رکھی ہے۔

مرنے والوں کا تذکرہ

یہ ایک عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے بارے میں رسائل وجرائد میں مضامین شائع کیے جاتے ہیں، اس کی یاد میں تعریفی مضامین چھپتے ہیں، اس کی یاد میں شان دار جلسے کئے جاتے ہیں۔ اِن سب میں یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کے کارنامے اوراس کی عظمتیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ سخت مغالطہ انگیزی (misleading) کا ذریعہ ہے۔

کسی کی موت پر جو اصل واقعہ پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ مرنے والا اپنی عظمت کے تمام نشانات کو اچانک چھوڑ دیتا ہے۔ موت اس کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ بالکل تنہا اور بے سروسامان ہوتا ہے۔ حال (present) کے لحاظ سے مرنے والے کا اصل پہلو یہی ہوتا ہے۔ لیکن تمام لکھنے اور بولنے والے، مرنے والے کے حال کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، وہ صرف اس کے ماضی (past) کو لے کر اس کی دنیوی بڑائیاں بیان کرتے ہیں، حالاں کہ مرنے والا عملاً اپنے اِس ماضی سے مکمل طور پر منقطع ہو چکا ہوتا ہے۔

موت کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ کسی انسان کے لیے انقطاعِ کلّی (total detachment) کے ہم معنی ہوتی ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کے پہلے موقع (first chance) کو کھو دیا، اور جہاں تک دوسرے موقع (second chance) کا سوال ہے، وہ کبھی کسی کو ملنے والا نہیں۔ ہر مرنے والا دراصل زندگی کے اِس سنگین پہلو کو یاد دلاتا ہے۔ لیکن یہی وہ پہلو ہے جس کا تذکرہ نہ تحریروں میں کیا جاتا ہے اور نہ تقریروں میں۔

مرنے والے کے فضائل وکمال کو پڑھ کر یا سن کر بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اِنھیں فضائل کا حامل ہے، حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں۔ مقررین اور محررین جس انسان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ ایک تاریخ ساز انسان تھا، عین ممکن ہے کہ اس وقت خود مرنے والے کا حال یہ ہو کہ وہ ایک بے تاریخ انسان بن کر حسرت وبے بسی کے عالم میں پڑا ہو۔

لمبی عمر

انسان ہمیشہ سے اس کا طالب رہا ہے کہ اس کو لمبی عمر حاصل ہو۔ اسی لیے اس موضوع پر ہمیشہ سب سے زیادہ ریسرچ کی گئی ہے۔ بادشاہ لوگ قدیم زمانے میں علم طب کی بہت زیادہ سرپرستی کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ علم طب ان کو لمبی عمر دے سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں میڈیکل سائنس کے شعبے میں سب سے زیادہ ریسرچ اسی موضوع پر ہو رہی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس کو لمبی عمر (longevity) حاصل ہو۔ مگر اس شعبے میں انسان کو اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ لمبی زندگی کا نہیں ہے، بلکہ زندگی کی کوالٹی (quality) کا ہے۔ بالفرض انسان کو لمبی عمر مل جائے، اور زندگی کی کوالٹی میں بہتری نہ ہو تو لمبی عمر کا کوئی فائدہ نہیں۔ موجودہ حالت میں لمبی عمر انسان کے لیے صرف اس کے مسائل میں اضافہ کرے گی، وہ اس کے مسائل کو حل کرنے والی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ بچہ ہوتا ہے، پھر وہ نوجوانی کی عمر میں پہنچتا ہے۔ پھر وہ جوان ہوتا ہے۔ پھر وہ ادھیڑ عمر میں پہنچتا ہے، اس کے بعد وہ بوڑھا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد وہ بستر پر پڑ جاتا ہے۔ اس مدت میں انسان مسلسل طور پر مختلف مسائل کی زد میں رہتا ہے: بیماری، حادثہ، بڑھاپا، وغیرہ۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ زندگی کی کوالٹی بڑھانے کا ہے، نہ کہ عمر کو لمبا کرنے کا۔

انسان اپنی زندگی میں جن مسائل سے دوچار ہوتا ہے، ان کا تعلق جسمانی زوال (degeneration) اور ڈی این اے (DNA) سے ہے۔ سائنٹفک ریسرچ کے مطابق، انسان کی پوری زندگی ڈی این اے سے کنٹرول ہوتی ہے، اور ڈی این اے ایک ایسی چیز ہے، جس پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ انسان پر بہر حال موت آتی ہے۔ اگر ایسا ہو کہ موت کے بعد کی زندگی میں انسان اسی قانونِ حیات کا موضوع بنا رہے، جس کا موضوع وہ موت سے پہلے کی عمر میں ہوتا ہے، تو انسان کو نہ موت سے پہلے کی زندگی میں سکون حاصل ہوگا، اور نہ موت کے بعد کی زندگی میں۔

اس معاملے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اصل مسئلہ لمبی عمر کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک نیا جسم حاصل ہوجائے، جو جسمانی زوال سے پاک ہو۔ موجودہ قوانین کا موضوع ہوتے ہوئے، لمبی عمر کا کوئی فائدہ نہ موت سے پہلے کے عرصہ حیات میں ہے، اور نہ موت کے بعد کے عرصہ حیات میں۔

اس مسئلے کا حل وہ ہے جس کو قرآن میں خلق جدید (ابراہیم :19، فاطر :16) کہا گیا ہے۔ خلق جدید کا مطلب ہے نئی تخلیق (new creation)۔ یعنی زوال سے پاک ایک نئے جسمانی وجود کا حاصل ہونا، اور اس قسم کی نئی تخلیق خالق کے سوا کسی اور کے قدرت میں نہیں۔ جو لوگ لمبی عمر چاہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ فَفِرُّوا إِلَى اللهِ (51:50) کے طریقے پر عمل کریں۔ یعنی زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرنا، زیادہ سے زیادہ اللہ کو پکارنا، زیادہ سے زیادہ اللہ سے دعا کرنا، تاکہ وہ ان کو مطلوب زندگی عطا کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو ان کی زبان سے شکر کا ایک کلمہ ان الفاظ میں نکلے گا: الحمدُ لِلهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الحزَنَ (35:34)۔ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کردیا۔ یہاں حزن (suffering) کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو دنیا کی زندگی کو انسان کے لیے بے لذت بنا دیتی ہیں۔ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو جسمانی اعتبار سے یا خارجی اعتبار سے موجودہ دنیا میں انسان کے لیے پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ انسان کی طلب کے اعتبار سے اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کو حزن سے خالی زندگی حاصل ہوجائے۔ حزن کے ساتھ کوئی بھی چیز انسان کو خوشی دینے والی نہیں۔

جنت کے بارے میں ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: من مات من أهل الجنة من صغير أو كبير يردون بني ثلاثين في الجنة لا يزيدون عليها أبدا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2562)۔ یعنی اہل جنت میں سے ہر شخص کی عمر تیس سال کردی جائے گی۔ خواہ موت کے وقت وہ اس سے زیادہ کا ہو یا کم کا۔ ان کی عمر اس سے زیادہ کبھی نہیں ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا

ہے کہ جنت میں انسان کو اس کا وہ مطلوب مل جائے گا، جو وہ چاہتا تھا، لیکن وہ اُس کو اِس دنیا میں نہیں ملا۔ یعنی ہمیشہ کے لیے جوانی کی عمر۔ انسان صرف جوانی کی عمر میں اس قابل ہوتا ہے کہ وہ بھر پور زندگی گزار سکے۔ جوانی کی عمر ہر انسان کی سب سے زیادہ مطلوب عمر ہے۔ انسان کا یہ مطلوب موت سے پہلے کے عرصۂ حیات میں اس کو نہیں ملتا، لیکن موت کے بعد کے عرصہ حیات میں اس کو یہ مطلوب اعلیٰ صورت میں حاصل ہو جائے گا۔

جنت کے بارے میں ایک لمبی حدیث آئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: إذا صار أهل الجنة إلى الجنة... أتي بالموت حتى يجعل بين الجنة والنار، ثم يذبح، ثم ينادي مناد: يا أهل الجنة لا موت...فيزداد أهل الجنة فرحا إلى فرحهم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2850)۔ یعنی جب جنت والے جنت کی طرف چلے جائیں گے... تو موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان لایا جائے گا پھر اسے ذبح کیا جائے گا پھر ایک پکارنے والا پکارے گا اے جنت والو اب موت نہیں ہے... اس سے اہل جنت کی خوشی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

انسان پیدائشی طور پر ایک مطلوب دنیا کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ساری امنگیں، اور اس کی ساری دوڑ دھوپ موجودہ دنیا میں اس مطلوب کو حاصل کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ وہ مختلف چیزوں کے بارے میں یہ رائے بناتا ہے کہ وہ مل جائے تو اس کی مطلوب دنیا اس کو حاصل ہو جائے گی۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ انسان نے پوری کوشش کی، اور اس کے بعد اس چیز کو پالیا جس کو وہ پانا چاہتا تھا، تاہم آخر میں اس نے دیکھا کہ بظاہر مطلوب کو پانے کے باوجود اس کو خوشی حاصل نہ ہو سکی۔ مثلاً اس نے مال حاصل کرنا چاہا، اور لمبی کوشش کے بعد اس نے مال حاصل کر لیا، لیکن مال اس کو اس کی مطلوب خوشی نہ دے سکا۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سیاسی اقتدار کو اپنا نشانہ بنایا، اور آخر کار سیاسی اقتدار حاصل کر لیا، لیکن اب اس کو معلوم ہوا کہ سیاسی اقتدار اس کو وہ چیز نہیں دے رہا ہے جو اس کا اصل مطلوب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کامیابی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو اور پھر جنت کو پالے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز اس کو حقیقی خوشی دینے والی نہیں۔

سفرِ حیات

اعداد و شمار کے مطابق، ہر دن ساری دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مر جاتے ہیں۔ ہر مرنے والا اپنے پیچھے ایک خاموش پیغام چھوڑ جاتا ہے، وہ اپنے بعد جینے والوں کو یہ خاموش پیغام دیتا ہے — اے جینے والو، موت کی تیاری کرو۔ اے دنیا کی تعمیر کرنے والو، آخرت کی تعمیر کی کوشش کرو۔ اے بے خبری میں جینے والو، اپنے آپ کو باخبر جینے والا بناؤ۔ اے دنیا میں اپنی حیثیت تلاش کرنے والو، آخرت کی جنت کے لیے اپنے آپ کو مستحق بناؤ۔ یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ جو لوگ اِس سے باخبر ہوں، وہی علم والے ہیں اور جو لوگ اس سے باخبر نہ ہوں، اُن کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-93-86589-01-9

9 789386 589019